WORLDWIDE CLASSICS

حاجی مراد

ٹالسٹائی

ترجمہ: مظفّر محمّد علی

دُنیا کے سب سے
بڑے ناول نگار کا
آخری شاہکار

عالمِ اسلام کے پہلے گوریلا لیڈر امام شامل
اور اُن کے نائب حاجی مُراد کی باہمی آویزش کی ڈرامائی داستان
جس سے رُوس کے حُریّت پسند مسلمانوں کی
تحریکِ آزادی کو زک پہنچی

میں آپ کو صرف یہ بتانے کے لیے لکھ رہا ہوں کہ مجھے آپ کا ہم عصر ہونے پر کس قدر خوشی محسوس ہوتی ہے....
اور ایک آخری پُرخلوص درخواست ہے: میرے دوست! لکھنے کی طرف لوٹ آؤ۔

بسترِ مرگ سے ایوان ترگینف کا خط، ٹالسٹائی کے نام

یہ شخص فن کا دیوتا ہے۔

فیودور دستوئیفسکی - رُوسی ادیب

میں نے ''حاجی مراد'' پڑھا تو اندازہ ہوا کہ یہ وہ شخص ہے جس سے ہمیں سیکھنا چاہیے۔ جب دوبارہ پڑھا تو میں دنگ رہ گیا....
میں نہیں سمجھتا کہ مجھ میں اتنی اہلیت، اتنی طاقت یا اتنی خواہش ہے کہ میں اتنی جزئیات نگاری کر سکوں جیسی ٹالسٹائی نے کی....
میں ٹالسٹائی کا پیروکار ہوں مگر میں اس جیسا کبھی نہیں لکھ سکتا۔

اسحاق بابِیل - رُوسی ادیب و نقاد

''حاجی مراد'' میرے لیے ادبِ عالیہ کو پرکھنے کی کسوٹی ہے۔ یہ دُنیا کی بہترین کہانی ہے.... یا یوں کہہ لیجیے کہ
اب تک میں نے جتنی کہانیاں پڑھی ہیں ان میں سب سے اعلیٰ کہانی ہے۔

ہیرلڈ بلُوم - امریکی نقاد

ٹالسٹائی اپنے کرداروں میں دیوتاؤں کی طرح رُوح پھونک دیتا ہے۔ ''حاجی مراد'' بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔

جارج سٹائنر - امریکی نقاد

''حاجی مراد'' ٹالسٹائی کی آخری، سب سے نکھری ہوئی کہانیوں میں سے ایک ہے۔

جان بیلی - برطانوی نقاد

لیو ٹالسٹائی

(1828-1910ء)

مصور: ایلیا ریپن
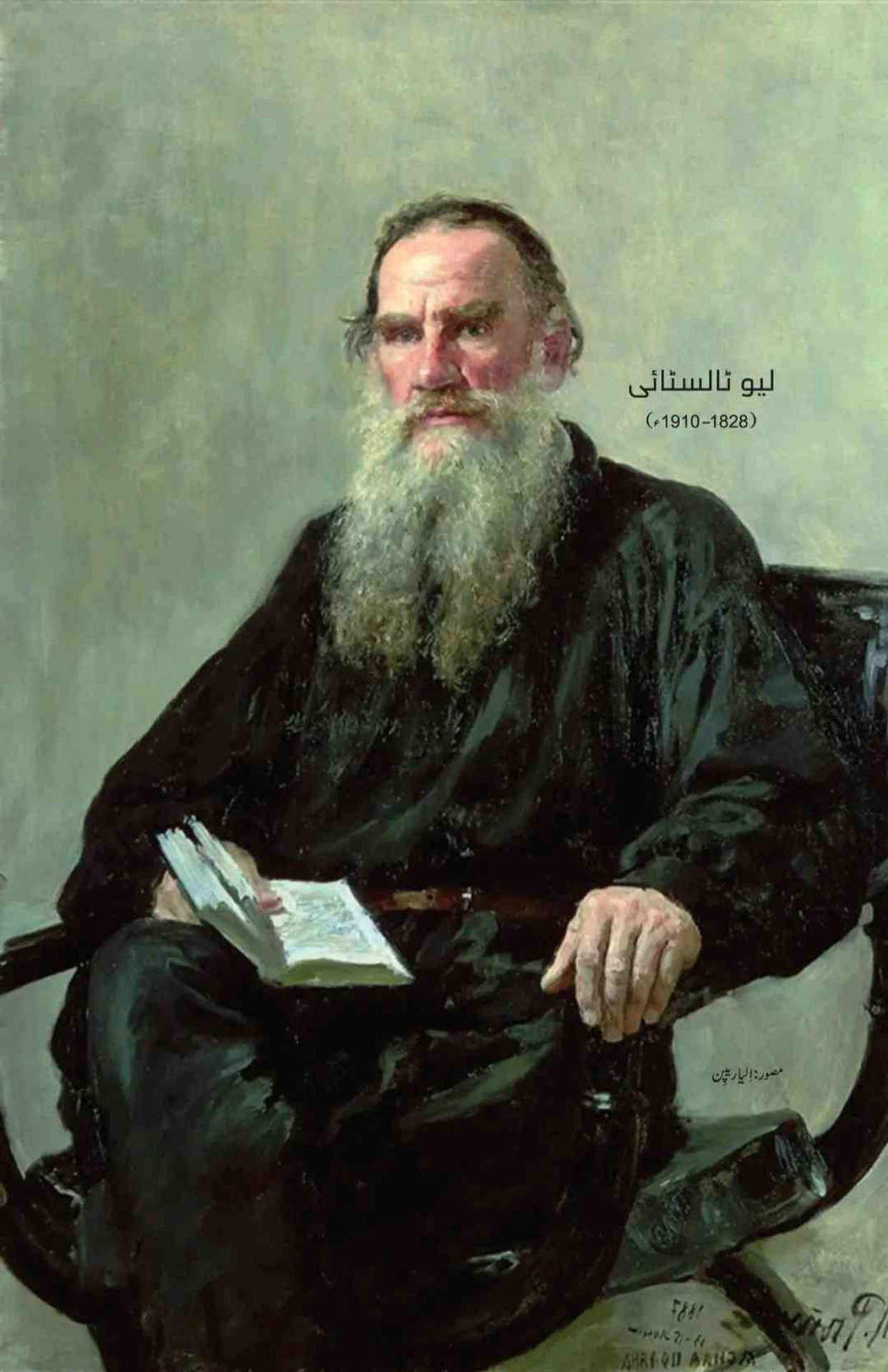
حاجی مُراد

(1851ء میں)

پبلشرز نوٹ

ٹالسٹائی: عدم تشدد کے نظریے کا بانی، ۱۸۲۸ء میں پیدا ہوا۔ جب مہاتما گاندھی ناتال (جنوبی افریقہ) میں تھے تو لیو ٹالسٹائی کے ساتھ چار سال تک خط و کتابت کرتے رہے۔ یوں یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ مہاتما گاندھی کے عدم تشدد کے نظریے کی تشکیل اسی دوران ہوئی اور اس کا سارا کریڈٹ ٹالسٹائی کو جاتا ہے۔

ٹالسٹائی ایک بہت بڑے جاگیردار خاندان کا چشم چراغ تھا اور اپنے دور کا سب سے بڑا ناول نگار اور فلسفی تھا۔ شہنشاہ روس کے ساتھ بھی اس کے خاندان کی قرابت داری تھی۔ لکھنے کا آغاز اس نے ۱۸۵۲ء میں، فوج میں ملازمت کے دوران اپنی آپ بیتی "بچپن، لڑکپن، جوانی" سے کیا۔ یہ کتاب ۱۸۵۷ء میں مکمل ہوئی۔ ۱۸۵۵ء میں سیوستو پول کے دفاع کی جنگ میں حصہ لینے کے بعد اس نے اپنی ریاست یسنایا پولیانا اور سینٹ پیٹرز برگ میں رہنا شروع کر دیا۔

چونکہ شہنشاہ کے محل میں اس کا آنا جانا تھا اس لئے ایک متوازن سے رومان کے بعد صوفیہ آندر یسیا، جو کہ زار روس نکولاس کے خاندانی ڈاکٹر کی بیٹی تھی، سے اس کی شادی ۱۸۶۲ء میں ہوئی۔

۱۸۶۵ء سے ۱۸۶۹ء تک اس نے اپنا شہرہ آفاق ناول "وار اینڈ پیس" لکھا۔ اور "آنا کار ینینا" کی تکمیل ۱۸۷۵ء سے ۱۸۷۷ء کے دوران ہوئی۔ اس کے بعد وہ روحانی بحران کا شکار ہوا جس کا ذکر اس نے اپنی تخلیق Confession (۱۸۷۹ء) میں کیا۔ ٹالسٹائی وہ پہلا وڈیرا ہے جس نے کسانوں کے بچوں کے لئے سکول کھولا۔ اور خود بھی اس سکول میں پڑھاتا رہا۔ اپنی املاک ان کے لئے وقف کر دیں۔ اپنی عظیم تخلیقات کی رائلٹی لینے سے انکار کر دیا۔ اس کی بعد کی تخلیقات میں آیون ایلچ (۱۸۸۶ء) کریوٹزر سوناتا (۱۸۸۹ء) اور پنر جنم Resurrection (۱۹۰۰ء) کے علاوہ "حاجی مراد" شامل ہیں۔ اس کی وفات ۱۹۱۰ء میں ہوئی۔

حاجی مراد کو بالعموم نامکمل ناول کہا جاتا ہے جو اس کی وفات کے بعد اشاعت پذیر ہوا۔ یہ اس لئے نہیں کہ یہ ناول ادھورا ہے یا اس میں کوئی فنی خرابی ہے بلکہ ایسا صرف اس لئے کہا جاتا ہے کہ ٹالسٹائی حسب عادت اس پر بار بار نظرثانی نہ کر سکا اور اسی وجہ سے اس کی اشاعت اس کی زندگی میں نہ ہو سکی۔ وار اینڈ پیس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ٹالسٹائی نے لگ بھگ تیس بار اسے ری رائٹ کیا۔

ناول کا آغاز بڑی خوبصورتی سے ہوتا ہے جس میں ٹالسٹائی اپنے ناول کے سب سے جاندار کردار حاجی مراد کو ایک جنگلی پھول "تارتار" سے تشبیہ دیتا ہے جسے توڑنے کی سعی میں وہ اپنے ہاتھ زخمی کر بیٹھتا ہے۔ بنیادی طور پر یہ کہانی اسی فلسفہ کی ترجمانی کرتی ہے کہ خوبصورت پھول کو شاخ سے جدا کرنے کے لئے خون کا نذرانہ دینا پڑتا ہے۔ جس کا تجربہ ٹالسٹائی کو وہ جنگلی پھول توڑتے وقت ہوا۔ اور پھول توڑنے کے بعد اس بات کا پچھتاوا بھی ہوا کہ شاخ سے جدا ہونے کے بعد نہ تو پھول کی وہ لطافت برقرار رہی اور نہ ہی خوبصورتی، نتیجے کے طور پر وہ پھول کو اسی کھلیان میں پھینک دیتا ہے۔

ظہور احمد خان

ایک موسم گرما میں کھیتوں کے راستے میں گھر لوٹ رہا تھا۔ فصل کاٹی جا چکی تھی اور اب ہر طرف انواع و اقسام کے پھول بہار دکھا رہے تھے۔ سرخ' سفید' گلابی' پیلے اور بعض پھول کئی رنگوں کا مجموعہ تھے۔ ان کی دل کشی آنکھوں میں کھبی جا رہی تھی۔ اور بھینی بھینی خوش بو سے دل و دماغ میں تازگی دوڑتی تھی۔

ان گلہائے رنگا رنگ کے نظارے سے آنکھوں کو فرحت اور دل کو سرور محسوس ہوتا تھا پھر ان کی مہک سے فضا اس قدر معطر ہو رہی تھی کہ دور دور تک خوشبو کی لپٹیں پہنچ رہی تھیں۔

ناگاہ میری نظر ایک نشیب پر پڑی' اونچے اور سخت پودوں پر نہایت ہی دل کش پھول کھلے ہوئے تھے۔

یہ پھول ہمارے علاقے میں "تاتار" کہلاتے تھے۔

میں نشیب میں اتر گیا اور آس پاس کی گھاس کو ہٹاتا ہوا ایک حسین پھول کے پودے تک پہنچ گیا۔

اس دلفریب پھول سے شہد کی ایک آوارہ مکھی شہد چرانے کو آگئی ہو گی مگر شاید وہ اس پھول کے حسن سے اس قدر مسحور ہو گئی تھی کہ شہد چرانا بھول کر اس کی حسین پتیوں میں پڑ کر سو گئی تھی۔

اس باصرہ نواز پھول کو توڑنے کے لئے میں نے ہاتھ بڑھایا مگر پودے نے میری اس قدر مزاحمت کی کہ میں گھبرا گیا۔

اول تو اس دل کش پھول کے پودے نے اپنے کانٹوں سے میرے ہاتھ ہی کو لہو لہان کر دیا دوسرے اس کی ٹہنی اتنی سخت تھی کہ میں کہیں پانچ چھ منٹ کی مسلسل کوشش کے بعد اس گل خوش رنگ کو توڑنے میں کامیاب ہو سکا۔

لیکن اپنے پودے کی ٹہنی سے جدا ہونے کے بعد پھول کی وہ دلکشی جاتی رہی۔

وہ اپنے پودے پر لگا ہوا ہی حسین نظر آ رہا تھا۔

وہاں سے توڑ لینے پر اس میں نہ تو وہ تازگی باقی رہی نہ خوب صورتی۔

میں نے اسے ایک طرف پھینک دیا اور افسوس کیا کہ ناحق اس کے لئے اپنے ہاتھوں

کا خون کیا اور وقت علیحدہ برباد ہوا۔

اس کا وہی مقام موزوں تھا جہاں وہ لگا ہوا تھا۔

مگر مجھے بار بار یہی خیال آ رہا تھا کہ اس پھول کو کس قدر قوت مدافعت و طاقت تحفظ ملی تھی۔ اس نے آخر تک اپنے مقام سے نہ ہٹنے کو زور لگایا' اور بڑی مشکل سے قابو میں آ سکا تھا۔ بہرحال وہ آسانی سے سپر انداز نہ ہوا تھا۔ واپسی میں اب میں نے راستہ بدل دیا اور کالی مٹی والے کھیتوں میں سے گزرتا ہوا بستی کی طرف روانہ ہوا۔

ان کھیتوں کو چند روز پیشتر ہی ہل چلا کر ہموار کیا گیا تھا۔

ہل نے ان کھیتوں کی مٹی کے بڑے بڑے ڈلوں کو توڑ پھوڑ کر اس قدر ہموار کر دیا تھا کہ ان میں کسی جنگلی جھاڑی کا وجود تو کجا' گھاس کا تنکا تک نظر نہیں آ رہا تھا۔

انسان بھی کس قدر ظالم و تباہ کن جانور واقع ہوا ہے! ان کھیتوں میں اس نے تنہا اپنی بقا کی خاطر کس قدر خود رو' پودوں اور روئیدگی کا قلع قمع کیا ہو گا۔

میں نے انسان کے ہلوں کے ہموار کئے ہوئے ان وسیع سیاہ کھیتوں پر ادھر ادھر نظر دوڑائی۔

میری نگاہ ایک چھوٹی سی ڈھیری پر پڑی۔

قریب جا کر دیکھتا ہوں تو مجھے اس قسم کا ایک کچلا ہوا پودہ نظر آیا جس کے پھول توڑنے کی کوشش میں میرے ہاتھ لہولہان ہو گئے تھے اور پھول نے آخری دم تک بڑی سختی سے مزاحمت کی تھی۔

یہ بھی وہی "تاتار" پودہ تھا۔

اس پودے میں تین شاخیں تھیں اور ان میں اب بھی چند منٹ پہلے کے دیکھے ہوئے حسین پھول لگے ہوئے تھے۔ مگر وہ اب حسین و دل کش نہ رہے تھے بلکہ کھیت کی کالی مٹی میں مل کر کالے ہو گئے تھے۔

دوسری شاخ بھی اگرچہ ہل سے کچل گئی تھی مگر اب بھی سختی سے کھڑی تھی۔ ہرچند اس کی کمر ٹوٹ گئی تھی' چھال قیمہ ہو گئی تھی۔ ریشے بکھر گئے تھے۔ مگر پھر بھی اس نے زمین نہیں چھوڑی تھی۔

کس قدر طاقت تحفظ و تاب مقاومت ہے اس پودے میں!

میں نے حیرت سے سوچا۔

انسان نے اگرچہ ہزاروں پودوں کو کچل کر تباہ کر دیا تھا مگر انسانی طاقت اس اولوالعزم

پودے کو نہ جھکا سکی تھی۔

اس نظارے سے مجھے کاکیشیا کا ایک واقعہ یاد آگیا جسے کچھ تو میں نے سنا تھا اور کچھ بہ چشم خود دیکھا تھا۔

وہ واقعہ جاں سوز اب تک میرے حافظہ میں موجود ہے جسے پیش کرتا ہوں:

۱۸۵۱ء کا ذکر ہے کہ ماہ نومبر کی سرد شام کو حاجی مراد اپنے اسپ تازی پر سوار مخالفین کے شہین اول (تاتار کا ایک گاؤں) میں داخل ہوا۔ یہ گاؤں روس کی سرحد سے پندرہ میل کے فاصلے پر ہو گا۔ موذن نے مغرب کی اذان ابھی ابھی ختم ہی کی تھی۔

پہاڑی ہوا کی تازگی جس میں گاؤں میں گھاس پھوس کے جلنے کا دھواں بھی شامل تھا ہر طرف چھائی ہوئی تھی۔

بستی کے کچے مکانات اس قدر قریب قریب بنے ہوئے تھے، جیسے شہد کی مکھیوں کا چھتہ اور اس قزاق بستی میں (قزاق ڈاکوؤں کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ کاکیشیا کا معرب ہے) مویشیوں کے ریوڑ، دن بھر چرنے کے بعد منتشر انداز میں داخل ہو رہے تھے۔ ساتھ ہی مردوں، عورتوں اور بچوں کی چیخ پکار بھی سنائی دے رہی تھی۔

حاجی مراد دراصل شمل کا نائب تھا۔ اور فنون حرب و قتال وغیرہ کا ماہر تھا حاجی مراد ہمیشہ اپنا علم اور چند درجن اپنے مریدوں کے ساتھ دھاووں کے لئے نکلا کرتا تھا۔ یہ مرید اس کا بے حد ادب کرتے تھے۔

لیکن اس دفعہ وہ ایک مفرور کی حیثیت سے نکلا تھا تاکہ کہیں پناہ تلاش کر سکے۔

اس کے جسم پر صرف ایک ردا اور سر پر تاتاری ٹوپی تھی۔ ردا کے اندر سے اس کی برقدم بندوق جھانک رہی تھی۔

اس بار حاجی مراد کے ساتھ حسب دستور درجنوں مرید نہ تھے بلکہ صرف ایک جانثار مرید ہی ہمراہ تھا کیونکہ وہ کم سے کم لوگوں کی نگاہ میں آنا چاہتا تھا تاکہ اس کے متعلق کسی کو خبر نہ ہو۔ اس دفعہ اس کی حالت ایک مفرور کی سی تھی۔

حاجی مراد کو اس وقت یہ اندیشہ لگا ہوا تھا کہ وہ کہیں بھانپ نہ لیا جائے۔ بستی والے مبادا اسے پہچان لیں۔ چنانچہ وہ ہر ایسے شخص سے گریزاں تھا، جو اس کا صورت آشنا ہو، تمام راہ وہ اپنی سیاہ اور پار ہو جانے والی آنکھوں سے اپنے گرد و پیش دیکھتا ہوا چلا آ رہا تھا۔

قصبے میں داخل ہوتے وقت بڑی سڑک کی طرف جانے کے بجائے وہ بستی کے ایک

تنگ راستے پر اپنے گھوڑے کو لے گیا۔ پھر ایک ساکلیہ (تاتاری مکان) کے پاس پہنچ کر اس نے احتیاطاً ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔

جھونپڑی کے سامنے کوئی متنفس نظر نہیں آیا مگر اس کے اوپر کے حصے میں ایک شخص بھیڑ کی پوستین تو پہنے پڑا ہوا تھا۔

حاجی مراد نے قریب پہنچ کر اس شخص کے آہستہ سے اپنے چابک سے ٹھوسا دیا تو پوستین کے نیچے سے ایک بوڑھا شخص برآمد ہوا۔ اس بوڑھے شخص کی سرخ و پرنم آنکھیں پلکوں سے خالی تھیں۔ بہرحال وہ دیدے پھاڑ کر حاجی مراد کو دیکھنے لگا۔

"السلام علیکم"

حاجی مراد نے اسے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام"

بوڑھے نے جواباً کہا۔ اس نے حاجی مراد کو پہچان لیا۔ کیوں کہ اس کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی تھی۔

اس کے بعد بوڑھے نے اپنی پتلی اور ناتواں ٹانگوں سے تختوں کی چھت کو کھٹکھٹایا۔ پھر لکڑی کی سیڑھی کے ذریعہ نیچے اتر آیا۔

قریب آ کر بوڑھے نے میزبانہ انداز میں حاجی مراد کے گھوڑے کی باگ کو تھامنا چاہا مگر قوی حاجی مراد جلدی سے اپنے مرکب پر سے کود پڑا۔

حاجی مراد کی ٹانگ میں خفیف سا لنگ تھا۔ اس کا میزبان اسے اندر دالان میں لے گیا۔

جب وہ اندر پہنچے تو ایک پندرہ سالہ لڑکا دروازہ میں داخل ہوا اور حاجی مراد کو اپنی چمکیلی سیاہ آنکھوں سے حیرانی کے ساتھ دیکھنے لگا۔

"بھاگ کر مسجد میں جاؤ اور اپنے ابا کو بلا لاؤ۔"

بوڑھے نے لڑکے سے کہا۔

بوڑھا حاجی مراد کو ایک دروازے سے گزار کر صحن میں لے گیا جہاں ایک ادھیڑ عمر کی عورت بشمت (لمبی آستینوں کا تاتاری کرتا) پہنے ہوئے بیٹھی تھی۔

حاجی مراد کو دیکھ کر وہ عورت ایک چھوٹی سی توشک لے کر آگے بڑھی اور اس سے مخاطب ہوئی۔

"خدا کرے تمہارا آنا مبارک ہو۔"

پھر اس نے مہمان کو بٹھانے کے لئے توشک بچھا دی۔

"اللہ تمہارے بچوں کی عمر دراز کرے۔"

"حاجی مراد نے اس عورت سے کہا

پھر اس نے جسم سے ردا علیحدہ کی اور اپنی بندوق' تلوار بوڑھے کے حوالے کی جس نے اپنے آقا کے دوسرے اسلحے کے ساتھ انہیں دیوار سے آویزاں کر دیا۔

حاجی مرادنے کمر سے اپنا پستول لگا لیا اور جسم پر کوٹ کو لپیٹ کر توشک پر آبیٹھا۔ بوڑھا ننگے پیر مئودبانہ آ کھڑا ہوا۔ پھر اس نے آنکھیں بند کر کے دعا کے لئے ہاتھ بلند کئے۔

حاجی مراد نے بھی اس کی تقلید کی۔ دعا ختم کرنے کے بعد دونوں نے اپنی پیشانی سے لے کر ڈاڑھی تک ہاتھ پھیرا۔

"نی اخبار" (کوئی خیر و خبر؟)

حاجی مراد نے بوڑھے سے دریافت کیا۔

"خبار یوک" (کوئی خاص خبر نہیں)

بوڑھے نے جواب دیا۔

"میں تو دور رہتا ہوں۔ آج ہی اپنے لڑکے سے ملنے آیا ہوں۔ ممکن ہے اسے حالات کا علم ہو۔"

بوڑھے نے پھر کہا۔

اور اپنی سرخ چندھی آنکھوں سے مراد کے سینے کی طرف دیکھنے لگا۔

حاجی مراد جانتا تھا کہ بوڑھا کچھ حال احوال سنانا نہیں چاہتا اس لئے صرف سرہلا کر رہ گیا۔

پھر اس نے بوڑھے سے کوئی سوال نہیں کیا۔

"خبریں اچھی نہیں ہیں۔"

اب بوڑھے نے خود ہی کہنا شروع کیا۔

"بس قابل ذکر ایک یہی خبر ہے کہ خرگوش اس مسئلہ پر غور کر رہے ہیں کہ چیلوں کو کس طرح دفع کیا جائے اور چیلیں اس تاک میں ہیں کہ خرگوشوں کے کس طرح تکے بوٹی کریں۔ ابھی کل ہی کا تو ذکر ہے کہ کتے روسیوں نے مشیت گاؤں میں آگ لگا دی تھی۔ خدا ان کے مونہہ جھلسے۔"

بوڑھے نے نفرت و غصے سے کہا۔

اس اثنا میں حاجی مراد کا مرید کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی مضبوط ٹانگیں لکڑی کے فرش پر آواز کر رہی تھیں۔ اس نے بھی حاجی مراد کی طرح ردا اتار کر اپنے اسلاح لٹکا دئے صرف خنجر اور پستول جسم پر رہنے دیا۔

"یہ کون شخص ہے؟"

بوڑھے نے مرید کے متعلق حاجی مراد سے دریافت کیا۔

"میرا مرید ہے اور اس کا نام الدر ہے۔"

حاجی مراد نے جواب دیا۔

"خوب"

بوڑھا بولا۔

اور اس نے الدر کو ایک نمدے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا

مرید اپنے پیر کے قریب بیٹھ گیا۔

بوڑھا ادھر ادھر کی باتیں کر رہا تھا اور اس نے حاجی مراد کو بتایا کہ پچھلے ہفتے بستی کے بہادر نوجوان نے دو روسی فوجیوں کو قتل کیا۔ ایک کو زندہ گرفتار کیا اور دوسرے کو پکڑ کر شمیل کے پاس بھیج دیا تھا۔

حاجی مراد عدم دلچسپی سے سنتا رہا۔

وہ کھوئے انداز میں دروازے کی جانب نگراں تھا جس میں سے باہر کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یہاں تک کہ باہر کے چوبی زینے پر چاپ سنائی دی اور صاحب خانہ جس کا نام سیدو تھا اندر داخل ہوا۔

سیدو کی عمر چالیس کے لگ بھگ ہو گی۔ اس کی چھوٹی سی داڑھی تھی اور لمبی ناک۔ سیاہ آنکھیں لیکن ان میں ایسی چمک نہ تھی جیسی اس کے پندرہ سالہ لڑکے کی آنکھوں میں تھی۔ لڑکا بھی اب اپنے باپ کے ساتھ آگیا تھا اور دروازے سے لگ کر بیٹھ گیا۔

صاحب خانہ نے اپنی لکڑی کی کھڑاؤں اتار دیں۔ پھر ٹوپی پیچھے جھکا کر مئودبانہ دو زانو حاجی مراد کے سامنے آ بیٹھا۔ اس نے بھی بوڑھے کی طرح دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور مونہہ پر پھیرے۔

ان آداب کے بعد اس نے گفتگو کا سلسلہ چھیڑ دیا۔

"شمیل (تاتاری امام) کے پاس سے آپ کی گرفتاری کے لئے حکم نامہ آیا ہوا ہے۔"

سیدو نے حاجی مراد کو حالات سناتے ہوئے کہا۔

"آپ کو زندہ یا مردہ گرفتار کرنے کا حکم ہے۔ پرسوں ہی شمیل کا آدمی یہ حکم دے کر گیا ہے۔ لوگ اس کی حکم عدولی کی مجال نہیں رکھتے۔ چنانچہ آپ کو نہایت چوکنا اور ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔"

سیدو نے کہا۔

"جب تک آپ میرے مکان میں ہیں کسی کی طاقت نہیں کہ میرے مرشد کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے۔ لیکن مکان سے باہر کیا کرنا چاہئے۔ اسی مسئلہ پر آیئے ہم کچھ غور و خوض کریں۔"

سیدو پھر بولا۔

حاجی مراد غور سے سنتا رہا۔ جب سیدو ختم کر چکا تو وہ بولا۔

"اچھا تو میں نے اب یہ طے کیا ہے کہ میں اپنے مرید کے ہمراہ روسی حکومت کے پاس ایک خط روانہ کروں۔ تم میرے مرید کے لئے کسی رہبر کا انتظام کر رکھو۔"

"میں اپنے بھائی عطا کو ساتھ کر دوں گا۔ جانا بیٹے جا کر ذرا بطا کو بلا لاؤ۔"

سیدو نے اپنے لڑکے سے کہا۔

لڑکا ہوا کی طرح روانہ ہوا' اور دس منٹ میں ایک پستہ قد شخص کو لے آیا۔ اس شخص کا چہرہ دھوپ سے کالا ہو گیا تھا' اور اس کے جسم پر پرانے سے کپڑے تھے۔

"کیا تم میرے مرید کی رہبری کر کے روسیوں تک پہنچا سکتے ہو۔"

حاجی مراد نے آتے ہی اس شخص سے دریافت کیا۔

"یقیناً' مجھ سے بہتر اس کام کے لئے دور دور تک آپ کو رہبر نہیں ملے گا۔ یوں اقرار ہر شخص کر لے گا۔"

بطا نے جواب دیا۔

"بہتر ہے۔ تمہیں انعام میں تین دئے جائیں گے۔"

حاجی مراد نے اپنی تین انگلیاں اونچی کر کے کہا۔

تین سے اس کی مراد نہ جانے کیا تھی۔ بطا آمادہ ہو گیا اور اس نے کہا کہ وہ روپے کی ایسی پرواہ نہیں کرتا بلکہ حاجی مراد کے کچھ کام آنا چاہتا ہے۔

حاجی مراد نے بطا کو داد دی اور بولا۔

"گفتگو مختصر ہونی چاہئے لیکن رسمی لمبی۔"

"میں بھی اپنی زبان کو قابو میں رکھوں گا۔"

بطا نے کہا۔

"اچھا دیکھو جس مقام سے دریائے آرگن مڑتا ہے وہاں جنگل میں دو پہاڑیاں ہیں۔
دیکھی ہوں گی تم نے؟"

حاجی مراد نے کہا۔

"جی ہاں۔"

بطا نے جواب دیا۔

"وہاں میرے چار سوار انتظار کر رہے ہیں' سمجھے؟"

مراد نے کہا۔

"جی ہاں۔ فرمایئے۔"

بطا بولا۔

"ان سے دریافت کرنا کہ خان محمد کس کا نام ہے۔ وہ اپنے فرض سے واقف ہے۔ کیا
تم خان محمد کو روسی فوج کے کمانڈر پرنس درنوخ تک پہنچا سکتے ہو؟"

حاجی مراد نے دریافت کیا

"کیوں نہیں۔ بہت اچھی طرح۔"

بطا نے جواب دیا۔

"بس تو جاؤ اور خان محمد کو شہزادہ درنوخ تک پہنچا کر آ جاؤ۔ میں جنگل میں تمہارا
انتظار کروں گا۔"

مراد نے کہا

"بہت مبارک۔"

بطا نے کہا اور آداب بجا لا کر رخصت ہوا۔

اس کے چلے جانے کے بعد حاجی مراد اپنے میزبان کی طرف متوجہ ہوا۔

"ایک آدمی کو چیچنی کی طرف بھی روانہ کرنا چاہئے۔"
حاجی مراد نے اس سے کہا۔
اور جیب سے کارتوسوں کی تھیلی نکالی مگر اسے پھر واپس جیب میں رکھ لیا کیونکہ دو عورتیں دروازے میں داخل ہو کر آ رہی تھیں۔
ان میں سے ایک تو سیدو کی بیوی ہی تھی۔ دوسری کوئی نوجوان لڑکی تھی جس نے سرخ پاجامہ اور سبز قمیض پہن رکھی تھی' اور اس کے تمام حاشیوں پر چاندی کے سکے جڑے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں بھی اتنی ہی چمک دار' سیاہ اور حسین تھیں جتنی اس کے پندرہ سالہ بھائی کی تھیں۔ اس کے چہرے پر بھولپن تھا مگر وہ سنجیدہ نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے نظر اٹھا کر مہمان کی طرف نہیں دیکھا۔ مگر اس کی موجودگی کو محسوس کر رہی تھی۔

سیدو کی بیوی ایک چھوٹی سی گول تپائی اٹھا لائی۔ اس پر چائے' مکھن' پنیر اور شرک (ایک قسم کی روٹی) رکھی ہوئی تھی اور لڑکی کے ہاتھ میں سلفچی ہاتھ دھونے کا مسالہ اور تولیہ تھا۔

حاجی مراد اور سیدو عورتوں کی موجودگی کی وجہ سے خاموش بیٹھے رہے الدر بھی اس طرح خاموش بیٹھا ہوا تھا جیسے پتھر کا بت۔ جب تک ان عورتوں کے چلنے پھرنے سے ان کے کپڑوں میں ٹکے ہوئے چاندی کے سکوں کی مترنم آواز آتی رہی وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے ہوئے اور آنکھیں جھکائے بیٹھا رہا۔ جب وہ چلی گئیں تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔
عورتوں کے جانے کے بعد حاجی مراد نے ایک کارتوس خالی کیا تو اس میں سے گولی اور بارود کے بجائے ایک کاغذ کی بتی نکلی جسے اس نے سیدو کو دیتے ہوئے کہا۔
"یہ کاغذ میرے لڑکے کے پاس پہنچا دینا۔"
"اور اس کا جواب کس جگہ پہنچایا جائے؟"
سیدو نے دریافت کیا۔
"اس کا جواب تمہارے پاس ہی آئے گا' جسے مجھ تک پہنچا دینا۔"
حاجی مراد نے جواب دیا۔
"بہتر ہے۔"
سیدو بولا۔
اور کاغذ کی اسی طرح بتی بنا کر اپنی بندوق کے کارتوس میں رکھ لیا۔ اس کے بعد اس

نے حاجی مراد کے ہاتھ دھلائے۔

حاجی مراد نے اوپر تک آستین لوٹ لیں جس سے اس کے سفید و قوی بازو نظر آنے لگے۔ پھر الدر کو لے کر ناشتہ کی میز پر جا بیٹھا۔

سیدو سامنے بیٹھ گیا اور اس نے اپنے مہمانوں کی تشریف آوری پر بڑی ممنونیت کا اظہار کیا۔ سیدو کا پندرہ سالہ خوب صورت بچہ بدستور دروازے سے لگا بیٹھا رہا۔ اس نے حاجی مراد کی طرف ٹکٹکی لگا رکھی تھی۔

حالانکہ حاجی مراد نے چوبیں گھنٹے سے کچھ نہ کھایا تھا۔ اس پر بھی اس نے اپنے میزبان کے ناشتے پر بجز تھوڑی سی روٹی اور پنیری کے زیادہ نہ کھایا ایک روٹی کے ٹکڑے پر اس نے تھوڑا سا شہد بھی چپڑلیا۔

"ہمارے ہاں کا شہد بڑے اعلیٰ درجے کا ہوتا ہے۔"

سیدو کے والد نے حاجی مراد کو اپنے ہاں کا شہد چکھتے ہوئے دیکھ کر فخر محسوس کر کے کہا۔

"جی ہاں آپ کے شہد کا شکریہ۔"

حاجی مراد نے جواب دیا۔

اور دستر خوان سے ہٹ گیا۔ الدر کا جی چاہ رہا تھا کہ کھائے جائے مگر اسے بھی اپنے آقا کی تقلید کرنی پڑی۔

سیدو دل میں جانتا تھا کہ حاجی مراد جیسے انسان کو اپنے مکان میں پناہ دے کر وہ اپنی جان کا خطرہ مول لے رہا ہے۔ کیونکہ شمیل (تاتاری امام) کے اس اعلان کے بعد کہ حاجی مراد کو زندہ یا مردہ گرفتار کیا جائے اسے (حاجی مراد کو) اپنے مکان میں رکھنا صریح موت کو دعوت دینا تھا۔

اس کے ساتھ ہی سیدو کو ایک خطرہ یہ بھی لگا ہوا تھا کہ بستی کے لوگوں کے کان میں یہاں حاجی مراد کی موجودگی کی بھنک اگر پڑ گئی تو وہ سب ابھی حاجی مراد کی گرفتاری کا مطالبہ کرنے لگیں گے۔ لیکن سیدو نے اپنی جان کی پرواہ نہیں کی بلکہ خوش تھا کہ وہ اپنا ایک مذہبی فریضہ ادا کر رہا تھا' چاہے اس میں جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔

"جب تک آپ میرے مکان میں ہیں اور جب تک میرے دم میں دم ہے آپ کا بال بیکا نہیں ہونے دوں گا۔"

سیدو نے حاجی مراد سے کہا۔

"خدا تمہیں جزائے خیر عطا کرے۔"
حاجی مراد نے کہا۔
اس کے بعد سیدو نے آتش دان میں کچھ اور کوئلے ڈالے۔ اچھی طرح دروازہ بند کیا
اور باہر نکل آیا' پھر قصبے میں پہنچا۔ وہاں ایک علیحدہ مکان میں اس کی فیملی رہا کرتی تھی۔
سیدو کی بیوی اور بیٹی ابھی سوئی نہیں تھیں بلکہ اپنے خطرناک مہمان کا ذکر کر رہی
تھیں جو ان کے مہمان خانے میں مقیم تھا۔

جس گاؤں میں حاجی مراد رات گزار رہا تھا وہاں سے دس میل کے فاصلے پر روسی فوج کی چوکی تھی۔ اس چوکی کا نام خوزن تھا۔ چنانچہ اس چوکی سے رات کو گشت کے لئے تین سپاہی اور ایک افسر نکلے۔ سپاہیوں نے بھی قزاق سپاہیوں کی مانند بھیڑ کی پوستین پہن رکھی تھی اور ان کے پیروں میں گھٹنوں تک کے جوتے تھے۔

بندوقیں لٹکائے وہ تقریباً پانچ سو قدم تک سڑک کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ اس کے بعد دوسری طرف مڑ گئے۔ رات کی تاریکی میں ان کے پیروں کے نیچے درختوں کے خشک پتے شور مچانے لگتے تھے۔ چلتے چلتے وہ کافی دور تک نکل گئے اور زمین پر پڑے ہوئے ایک خشک درخت کے پاس جا کر رک گئے۔

اندھیری رات کے تارے کچھ تو درختوں کی اوٹ میں آ گئے تھے، باقی کو جنگل کی تاریکی نگل گئی تھی۔ لیکن میدان اور درختوں کی کشادہ ٹہنیوں میں سے وہ صاف چمکنے لگتے تھے۔

"غنیمت ہے کہ یہاں کی زمین خشک ہے۔"

افسر نے اپنے سپاہیوں سے کہا۔

"جی ہاں" ایک سپاہی نے جواب دیا۔

اور تمباکو سلگانے کی کوشش کرنے لگا۔

گھات کے لئے نکلنے والے فوجیوں کو تمباکو پینا منع تھا۔ مگر یہ برائے نام گھات کی پارٹی تھی۔ یہاں فوجی چوکی کی بھی صرف اس لئے ضرورت پیش آئی تھی کہ آس پاس کے پہاڑی لوگ چپکے سے جنگل میں توپ لے آتے تھے، اور خوزن پر گولے برسانے لگتے تھے۔ سپاہی لیٹ گئے اور تمباکو پینے لگے۔ باتیں بھی کرتے جاتے تھے۔

قریب سے گیدڑوں کی آواز آ رہی تھی اور رات کے سناٹے میں وحشت ناک معلوم ہو رہی تھی۔

"گیدڑوں کی آواز کتنی بری معلوم ہو رہی ہے۔"

ایک سپاہی نے کہا۔

"وہ تمہارا مذاق اڑا رہے ہیں، کیونکہ تم ان کی طرف پشت کئے لیٹے ہو۔"

دوسرے سپاہی نے کہا۔

اس کے بعد سوائے ہوا کے سناٹے کے ہر طرف خاموشی چھا گئی۔

"اچھا پینوخ سچ بتاؤ' کیا تم کبھی سستی محسوس کرتے ہو؟"

پینوخ نامی سپاہی نے اپنے ساتھی اڈوخ سے دریافت کیا۔

اڈوخ بولا

"سستی؟ نہیں تو۔ کیوں؟"

"میں تو کبھی کبھی محسوس کرنے لگتا ہوں۔" پینوخ نے جواب دیا۔

"وجہ کیا ہے آخر؟"

اڈوخ نے پوچھا۔

"کبھی کبھی گھر کی یاد آ جاتی ہے۔"

پینوخ نے جواب دیا۔

"کیا تمہارا گھر آسودہ ہے؟"

اڈوخ نے سوال کیا۔

"نہیں۔ مگر مفلوک الحال بھی نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ میں اپنے بھائی کے بجائے فوج میں بھرتی ہوا ہوں' کیونکہ بھائی کے پانچ بچے ہیں اور میری تو ابھی شادی ہی ہوئی تھی۔ اس لئے میں فوج میں چلا آیا۔

پینوخ نے کہا۔

"خیر تمباکو پیو"

اڈوخ نے کہا۔

"لیکن انہوں نے ابھی اپنا پائپ سلگایا بھی نہ تھا کہ دور درختوں کے خشک پتوں کی کھڑکھڑاہٹ ہوئی۔ دونوں کے کان کھڑے ہوئے اور انہوں نے اپنے بقیہ دونوں ساتھیوں کو بھی جھنجھوڑ کر جگایا جو بکتے ہوئے اٹھے۔

"چپ چپ۔"

اڈوخ نے آہستہ سے کہا۔

چاروں دم سادھ کر پڑ گئے۔ انسانی قدموں کی چاپ قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔ اندھیرے میں درختوں کے پتے اور ٹہنیاں کھڑکھڑا رہی تھیں۔ آخر چند منٹ بعد انہیں تاروں کی چھاؤں میں دو انسانی قامت نظر آئے۔ ایک لمبا' ایک میانہ۔

جوں ہی وہ قریب آئے۔ ہینوخ نے مع اپنے چاروں ساتھیوں کے بندوق چھتیار کر انہیں للکارا۔

"کون جا رہا ہے؟"

"دوست ہیں۔"

میانہ قامت سے آواز آئی۔

یہ حاجی مراد کا فرستادہ رہبر "بطا" تھا۔

"بندوق اور تلوار کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم پرنس سے ملنا چاہتے ہیں۔"

بطا نے مزید کہا۔

اس کا دوسرا دراز قامت ساتھی خاموش کھڑا تھا۔

"یہ کوئی فرستادہ معلوم ہوتا ہے' اور پرنس درنوخ سے ملنے کا خواہاں ہے۔"

ہینوخ نے اپنے ساتھیوں کو بتایا۔

"ہاں پرنس درنوخ سے ایک ضروری کام ہے۔"

بطا نے ٹوٹی پھوٹی روسی زبان میں کہا۔

"اچھا اچھا۔ ہم تمہیں ان کے پاس لے چلیں گے۔"

ہینوخ نے کہا۔

اس کے بعد اڈوخ اور دوسرے سپاہی سے بولا۔

"تم دونوں انہیں لے جاؤ اور افسر کے سپرد کر آؤ۔ پھر واپس آ جانا اور دیکھو ان دونوں کو اپنے آگے رکھنا اچھا اب جاؤ۔"

چنانچہ بطا اور خان محمد کو لے کر دونوں سپاہی روانہ ہوئے۔

"آخر رات کو ان لوگوں کے آنے کا مقصد کیا ہو سکتا ہے۔"

جب وہ چلے گئے تو نکیتن نے ہینوخ سے کہا۔

"کوئی کام ہی ہو گا۔ دیکھو اب خنکی ہو چکی ہے۔"

بلخ نے کہا اور اپنا کمبل اوڑھ لیا۔

تقریباً دو گھنٹے کے بعد اڈوخ اور اس کا ساتھی سپاہی واپس آ گئے۔

"دونوں کو آفیسر کے سپرد کر آئے؟"

ہینوخ نے ان سے پوچھا۔

"ہاں کرنل صاحب بھی سوئے نہیں تھے۔ دونوں کو سیدھا ان کے پاس پہنچا دیا گیا اور

یار وہ دونوں بظاہر احمق سے آدمی تو خوب نکلے راستے بھر مزے مزے کی باتیں کرتے ہوئے گئے۔"

اڈوخ نے کہا۔

"وہ جانور کیا مزے کی باتیں کریں گے۔"

نکیتن نے جل کر کہا۔

"سچ۔ وہ تو اپنی ہی طرح ہیں جیسے روسی ہوں۔ ایک نے کہا کہ اس کی ابھی شادی ہوئی ہے۔ بڑے اچھے لوگ معلوم ہوتے ہیں۔"

اڈوخ نے کہا۔

"ہاں ایسے اچھے لوگ کہ اگر تم تنہائی میں انہیں مل جاؤ تو تمہارا قیمہ کر ڈالیں۔"

نکیتن نے اسی طرح جل کر کہا۔

"میرا خیال ہے کہ اب صبح قریب ہے۔"

پینوخ بولا۔

"ہاں ستارے ڈوب چلے ہیں۔"

اڈوخ نے کہا اور لیٹ گیا۔

اس کے بعد سب خاموش ہو گئے۔

قلعہ کی بارکوں اور سپاہیوں کے کوارٹروں میں خاموشی اور اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ مگر بلند و خوش نما فوجی کوارٹر اب بھی روشن نظر آ رہے تھے۔

انہی خوش نما بنگلوں میں سے ایک بنگلے میں پرنس درنوخ جو کیوزن رجمنٹ کا کمانڈر تھا رہتا تھا۔ یہ شاہی ایڈی کانگ بھی تھا۔ اور کمانڈر انچیف کا بیٹا بھی۔

پرنس درنوخ کی بیوی ماریہ حسن میں شہرہ آفاق تھی' دونوں میاں بیوی اس قلعہ میں شاہانہ زندگی گزار رہے تھے۔ لوگ یہی سمجھتے تھے' ورنہ یہ دونوں میاں بیوی تو اسے تکلیف کی زندگی خیال کرتے تھے۔

بہرحال اس وقت رات گئے تک پرنس درنوخ ایک میز کے سامنے تین چار بڑے فوجی افسروں کے ساتھ تاش کھیلنے میں مصروف تھا۔ حسین ماریہ بھی وہیں بیٹھی ہوئی تھی اور اپنے حسن کے جادو سے حاضرین کو مسحور کر رہی تھی۔

تاش کے دوران میں کسی غلط چال پر ایک بڑے افسر نے دوسرے بڑے افسر کی خبر لی اور ان میں بدمزگی سی پیدا ہو گئی۔

"چلو رفت گزشت کرو۔"

ماریہ مسکرا کر بولی۔

عین اس وقت اجازت لے کر پرنس کا سیکرٹری اندر داخل ہوا اور بولا کہ ڈیوٹی کا آفیسر ملنے آیا ہے۔

"معاف کیجئے" پرنس نے اپنے ساتھیوں سے کہا اور باہر چلا گیا۔

اپنے ملاقاتیوں سے کافی دیر بعد چھٹکارا پا کر پرنس درنوخ اپنی بیوی کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ اب تک جاگ رہی تھی۔

"حاجی مراد آیا ہو گا؟"

پرنس ماریہ نے تلخی سے اپنے شوہر سے دریافت کیا۔

ماریہ کئی روز سے سن رہی تھی کہ حکومت روس اور حاجی مراد میں مصلحت کی کوشش ہو رہی ہے۔ اسی لئے اسے خیال ہوا کہ حاجی مراد ہی اس کے شوہر سے اس وقت ملنے آیا ہو گا۔

"نہیں حاجی مراد نہ تھا بلکہ اس نے اپنے آدمی بھیجے تھے۔"

پرنس درنوخ نے جواب دیا۔

ماریہ نے پوچھا۔

"تاکہ حاجی مراد سے کل ایک جنگل میں ملاقات کا وقت تعین کیا جا سکے"

پرنس درنوخ نے کہا۔ کہیں شب کے دو بجے تک دونوں میاں بیوی سو گئے۔

حاجی مراد اپنی گرفتاری کے اعلان کے بعد سے کئی شب تک نہ سو سکا تھا۔ مگر رات کو سیدو کے مکان پر پڑ کر وہ ایسا سویا کہ اسے برائے چندے کسی چیز کا ہوش نہ رہا۔ مگر وہ لباس پہنے سویا تھا تاکہ بروقت ضرورت کپڑے پہننے میں وقت ضائع نہ ہو۔

اس سے ذرا فاصلے پر الدر سو رہا تھا۔ وہ چت پڑا ہوا تھا۔ اس کے سینے پر کارتوسوں کی پٹی لپٹی ہوئی تھی اور اس کا منڈا ہوا سر تکئے سے ایک طرف پڑا ہوا تھا۔

قریب میں آتشدان کے اندر آگ کجلا رہی تھی اور اس کی مدہم روشنی صرف در و دیوار پر پڑ رہی تھی۔

آدھی رات گزری ہو گی کہ باہر لکڑی کے فرش پر کھٹکا ہوا۔

حاجی مراد سپاہی کی طرح چوکنی نیند سویا کرتا تھا۔ چنانچہ آواز پر فوراً اس کی آنکھ کھل گئی اور سب سے پہلے اس کا ہاتھ اپنے پستول پر گیا۔

وہ سیدو تھا۔

حاجی مراد نے اسے دیکھا اور دریافت کیا۔

"کیا بات ہے سیدو؟"
آپ جب یہاں آئے تھے تو ایک عورت نے چھت پر سے آپ کو دیکھ لیا تھا' اس نے اپنے شوہر سے کہہ دیا- چنانچہ اب شاید پوری بستی یہاں آپ کی موجودگی سے باخبر ہو چکی ہے- میں اسی چیز سے خبردار کرنے آیا ہوں-
سیدو نے جواب دیا-
پھر بولا-
"لوگ مسجد میں جمع ہو رہے ہیں اور آپ کو پکڑنے کے متعلق مشورے کر رہے ہیں-"
"خیر تو اب مجھے یہاں سے چل دینا چاہئے-"
حاجی مراد نے کہا-
"گھوڑوں پر زین کس دی گئی ہے-"
سیدو نے کہا-
"الدر-"
"حاجی مراد نے آہستہ سے الدر کو جگاتے ہوئے کہا-
وہ اپنے آقا کی آواز سن کر ایک دم اٹھ بیٹھا اور اپنی ٹوپی سنبھال لی-
حاجی مراد نے جلد جلد جسم پر اپنے اسلاح آراستہ کئے اور اوپر سے ردا اوڑھ لی- اس کے بعد وہ اور الدر فوراً خاموشی سے مکان سے نکل گئے-
لڑکے نے ان کے کسے کسائے گھوڑے لا کھڑے کئے-
راستے پر ٹاپوں کی آواز سن کر کسی نے اپنے مکان کی کھڑکی سے سر نکال کر جھانکا- پھر وہ شخص پہاڑی پر واقع مسجد کی طرف اپنی کھڑاؤں پہن کر بھاگا-
چاندنی رات تھی-
روشن ستاروں کی جوت میں تاریک بستی دھندلی دھندلی نظر آ رہی تھی- اور مسجد کے بلند مینار اندھیرے میں مدھم دکھائی دے رہے تھے مسجد میں بہت سے آدمیوں کی آوازیں آ رہی تھیں-
"خدا تمہیں جزائے خیر دے-"
حاجی مراد نے اپنے اسپ تازی پر تیزی سے سوار ہوتے ہوئے اپنے میزبان سے کہا-

اس کے بعد اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی جو بسرعت تمام شاہراہ کی طرف روانہ ہوا۔
جوں ہی گھوڑے سڑک پر پہنچے تو پہلے ایک تاریک ہیولا نمودار ہوا۔
پھر دوسرا اس کے بعد تیسرا
"ٹھیرو۔ کون ہو تم؟"
ایک شخص نے ان میں سے ڈانٹ کر کہا۔
حاجی مراد جواب دینے کے بجائے پستول نکال کر ان پر گھوڑا چڑھا لے گیا۔
مجمع کاہی کی طرح پھٹ گیا۔
اس کے بعد حاجی مراد گھوڑے پر سرپٹ روانہ ہوا۔ اس کے پیچھے الدر۔ مگر ان کے عقب سے دو تین بندوقوں کی آواز آئی' اور گولیاں سنسناتی ہوئی نکل گئیں۔ گھوڑے ہوا ہو گئے۔

لیکن تین چار سو قدم چلنے کے بعد حاجی مراد نے گھوڑے کو روکا۔ اور کان لگا کر سننے لگا۔ سامنے کسی چشمے کے بہنے کی آواز آ رہی تھی اور دور بستی سے مرغوں کی بانگ بلند ہو رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی پیچھے سے کئی گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز بھی آ رہی تھی۔
حاجی مراد نے گھوڑے کو پھر ایڑ لگائی مگر اس کے تعاقب کنندگان نے جلد اسے آ لیا۔
کوئی بیس بائیس آدمی ہوں گے۔ ان کا مقصد حاجی مراد کو گرفتار کرنا تھا یا کم از کم شمیل (تاتاری امام) کے علم میں یہ لانا مقصود تھا کہ بستی والوں نے حاجی مراد کا تعاقب کر کے اسے پکڑنے کی کوشش کی تھی۔
جب وہ لوگ بالکل قریب آ گئے تو حاجی مراد نے اپنی بندوق نکالی۔ الدر نے بھی اس کی تقلید کی۔
"کیا چاہتے ہو۔ کیا تم میری گرفتاری کے درپے ہو؟"
حاجی مراد نے ڈپٹ کر اس سے دریافت کیا۔
اس کے بعد پھر بولا
"اچھا ہمت ہے تو مجھے گرفتار کر لو۔ یہ کہہ کر اس نے اپنی بندوق تان لی۔ (یہ لوگ بھی سب مسلمان ہی تھے)
لوگ جھجک کر رہ گئے۔ حاجی مراد نے پھر اپنے گھوڑے کو آگے بڑھایا مگر وہ لوگ پھر اس کا تعاقب کرنے لگے۔ لیکن قریب آنے کی کسی نے جرات نہیں کی۔
جب وہ دریا پار کر گیا تو لوگ چیخ کر بولے۔

"ہماری بات سنتے جاؤ۔"

اس کے جواب میں حاجی مراد نے بندوق داغ دی اور گھوڑے کو سرپٹ چھوڑ دیا۔
چند منٹ بعد نہ تو اس کے تعاقب کرنے والوں کی آوازوں کا کوئی وجود رہا تھا اور نہ مرغوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

صرف بہتے دریا کا ترنم سنائی دے رہا تھا۔

چاروں طرف لق و دق جنگل پھیلا ہوا تھا۔

اور کبھی کبھی الو کی ہوک اور گیدڑوں کا "پدرم سلطان بود" کا شور سنائی دینے لگتا تھا۔
اسی جنگل میں طے شدہ پروگرام کے مطابق حاجی مراد کے مرید اپنے مرشد کا انتظار کر رہے تھے۔

آخر تھوڑی دور جا کر حاجی مراد رک گیا۔ پھر کچھ وقفہ کے بعد اس نے سیٹی بجائی اور جواب کا انتظار کرنے لگا۔

آخر چند لمحات بعد ہی جنگ سے اس کو اسی قسم کی سیٹی میں جواب ملا۔

وہ اس طرف مڑ گیا۔

چند قدم چلنے کے بعد اس نے گرے ہوئے درختوں کے پاس آگ روشن دیکھی جس کی روشنی میں آدمیوں کی ہلکی ہلکی پرچھائیں نظر آ رہی تھیں۔

آگ کے سامنے چار آدمی بیٹھے ہوئے تھے اور قریب میں ان کے گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔

ان میں سے ایک شخص حاجی مراد کو دیکھ کر جلدی سے اس کے پاس آیا اور ادب سے اس کے گھوڑے کی باگ تھام لی۔

یہ شخص حاجی مراد کا بھائی تھا جو اس کے بجائے گھر کا انصرام کیا کرتا تھا۔

"آگ بجھا دو۔"

حاجی مراد نے گھوڑے سے اتر کر کہا۔

آدمیوں نے اسی وقت آگ بجھا دی۔

"کیا بطا یہاں آیا تھا؟

حاجی مراد نے دریافت کیا۔

"ہاں وہ خان محمد کو ساتھ لے گیا ہے۔ کافی دیر ہوئی۔"

ایک شخص نے جواب دیا۔

"وہ لوگ کون سے راستے سے گئے ہیں؟"
حاجی مراد نے پوچھا۔
"اس طرف سے"
خانش نے مخالف سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
"ٹھیک ہے۔"
حاجی مراد بولا۔
اور اپنی بندوق بھرنے لگا۔
"ہمیں ہوشیار رہنا چاہئے۔ کیونکہ تعاقب کا خوف ہے۔"
حاجی مراد نے آگ بجھانے والے شخص سے کہا۔
اس شخص کا نام غمزالو تھا۔ اس نے اپنی بندوق اٹھائی اور پہرہ دینے کے لئے جنگل میں اونچائی پر چلا گیا۔

الدر نے حاجی مراد کا اور اپنا گھوڑا باندھا پھر بندوق اٹھا کر دوسری طرف پہرے کے لئے چلا گیا۔ اب جنگل میں سخت تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔

گھنے درختوں کی وجہ سے اندھیری رات کا سیاہ آسمان اور اس کے جگمگاتے تارے بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔

حاجی مراد نے ایک ٹیلے پر چڑھ کر ستاروں سے وقت کا اندازہ لگایا۔
ہرنی اور کھٹولا افق کے نیچے لٹک چکے تھے اور صبح صادق کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔

فجر کی نماز کا وقت ہو گیا تھا۔ چنانچہ وضو کیا پھر مصلی بچھا کر فریضہ نماز ادا کرنے لگا۔
نماز سے فارغ ہو کر وہ واپس اپنی ردا پر آ بیٹھا اور عالم استغراق میں کھو گیا۔
اسے ہمیشہ اپنے مقدر پر بھروسہ رہا کرتا تھا' جب کبھی اسے کوئی مہم سر کرنی ہوتی تو وہ اپنی کامیابی کی پیش بینی کر لیتا تھا۔
باستثنائے چند واقعات کے اسے ہمیشہ کامیابی ہی ہوتی تھی۔
اپنی تمام طولانی فوجی زندگی میں کامیابی اس کے قدم چومتی رہی۔ چنانچہ آئندہ کے لئے بھی اس کا یہی خیال تھا۔
عالم خیال میں وہ تصور کرتا کہ جب درنوخ اس کے تحت میں فوج کا ایک دستہ دیدے گا تو وہ مارچ کر کے شمل کو گرفتار کر لے گا۔ اور اس سے اپنا بدلہ لے گا۔

اس کے صلہ میں زار روس کی حکومت نہ صرف اسے عواریہ کی حکمرانی ہی عطا کر دے گی بلکہ شینیا کا بھی وہ حاکم بنا دیا جائے گا۔
انہی خیالات میں اس کی آنکھ جھپک گئی۔
شمل پر حاجی مراد خار کھاتا تھا اسی طرح شمل بھی حاجی مراد کے خون کا پیاسا تھا۔
چنانچہ اپنی غنودگی کے عالم میں حاجی مراد خواب دیکھنے لگا۔ جیسے اس نے شمل پر چڑھائی کر کے اسے زیر کر لیا ہو۔
شمل کی بیوی ماتم کر رہی ہو خود شمل بھی فرط غم سے چیخ رہا ہو۔
مگر یہ چیخ پکار نہ تو شمل کی تھی اور نہ اس کی بیوی کی بلکہ گیدڑ شور مچا رہے تھے۔
جس سے حاجی مراد کی آنکھ کھل گئی۔
خان محمد نے حاجی مراد کو ہوشیار کیا۔
خان محمد اپنے مشن سے ابھی ابھی لوٹا تھا (وہ پروگرام کے مطابق بطا کو ساتھ لے کر پرنس درنوخ سے مل کر آ رہا تھا) اس نے حاجی مراد کو اپنے مشن کی کامیابی کی پوری تفصیل سنائی اور اس کو بتایا کہ میشک سے آگے جہاں روسی لکڑ ہاڑے لکڑیاں کاٹتے ہیں۔ وہاں پرنس نے اس سے ملنے کا وعدہ کیا ہے۔
حاجی مراد نے تفصیل سننے کے بعد کہا۔
"مجھے پرنس درنوخ کے اپنے الفاظ سناؤ کہ اس نے روسیوں کے پاس میرے پہنچنے کی تحریک کا کن لفظوں میں جواب دیا تھا۔"
"پرنس درنوخ نے وعدہ کیا ہے کہ روسی آپ کو بطور مہمان کے خوش آمدید کہیں گے اور آپ کی فلاح و بہبود مد نظر رکھیں گے۔"
بطا اور خان محمد نے بیک زبان کہا۔
"چنانچہ حاجی مراد نے اسی وقت اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ تمام ساز و سامان درست کریں۔ اسلحہ اور کپڑے وغیرہ صاف کریں۔ تاکہ روسیوں کے درمیان وہ صاف ستھرے ہو کر پہنچیں۔

قلعہ سے چھ میل آگے بڑھ کر روسی سپاہی جمع ہو گئے تھے اور آپس میں ہنسی مذاق کر رہے تھے کہ اتنے میں بندوقوں کی آواز آئی گولیاں چلنے لگیں اور پہاڑی لوگوں نے ایک سپاہی کو زخمی کر دیا۔ اس کے بعد سب بھاگ گئے۔

"کیا بات ہے؟"

تھوڑی دیر بعد پرنس درنوخ نے نمودار ہو کر ایک افسر سے دریافت کیا۔

"کچھ نہیں پرنس ایک معمولی سی جھڑپ ہو گئی تھی۔ اپنا ایک آدمی اس میں زخمی ہو گیا۔"

پولتراسکی نے جواب دیا

"کیا شدید زخمی ہوا ہے؟"

پرنس درنوخ نے پوچھا۔

"جی ہاں۔"

پولتراسکی۔

"خیر۔ اچھا تم بتا سکتے ہو کہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

درنوخ نے کہا۔

"آپ کو ہی علم ہو گا جناب۔"

پولتراسکی نے جواب دیا۔

"حاجی مراد نے خود کو ہمارے سپرد کر دیا ہے۔ ہم اسے لینے جا رہے ہیں۔"

پرنس درنوخ نے کہا۔

"کیا سچ؟" پولتراسکی نے تعجب سے دریافت کیا۔

"ہاں کل رات کو ہمارے پاس اس کے ایلچی آئے تھے۔"

پرنس درنوخ نے جواب دیا۔

"ہاں۔ حاجی مراد شالن گیٹ کے پاس میرا انتظار کر رہا ہو گا۔ تم بھی تھوڑی دیر بعد وہاں آ جانا۔"

پرنس درنوخ نے کہا۔

پولتراسکی نے سلوٹ کیا اور اپنی کمپنی سے آ ملا۔

قلعہ کی طرف جاتے میں پولتراسکی نے راستے میں چند سواروں کو دیکھا اور ان میں

سے ایک سوار اپنے وقار و دبدبہ کی وجہ سے سردار معلوم ہوتا تھا۔ اس کے جسم پر سنہری دستے کی تلوار اور خنجر نظر آ رہے تھے۔

یہ حاجی مراد تھا۔

حاجی مراد پولتراسکی کے قریب آیا اور دبدبہ کے ساتھ تاتاری زبان میں اس سے کوئی سوال کیا۔

پولتراسکی نے اشاروں میں مسکرا کر جواب دیا کہ وہ تاتاری نہیں سمجھتا۔

حاجی مراد بھی مسکرایا۔

اس کی مسکراہٹ پولتراسکی کو بہت معصومانہ سی محسوس ہوئی اس کے خیال میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ خطرناک پہاڑی حاجی مراد دیکھنے میں اس قدر خوش خلق ہو سکتا ہے۔

پولتراسکی کو ایسا معلوم ہوا جیسے حاجی مراد اس کا پرانا دوست ہے۔

حاجی مراد میں پولتراسکی کو ایک حیرت انگیز یہ چیز بھی نظر آئی کہ اس کی ایک آنکھ نسبتاً دوسری آنکھ سے ذرا فاصلے پر تھی اور اس کی یہ عقابی آنکھیں برما دینے والی تھیں۔

حاجی مراد کے جسم پر صاف ستھرا لباس تھا۔

اسی طرح اس کے دوسرے ساتھی بالخصوص خان محمد نے بھی اچھا لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ خان محمد ہی تو گزشتہ رات کو حاجی مراد کا پیام لے کر روسی سپاہ کے کمانڈر پرنس درنوخ کے پاس گیا تھا۔

چند منٹ بعد پرنس درنوخ بھی نمودار ہوا۔

پولتراسکی نے آگے بڑھ کر اشارے سے حاجی مراد کو سمجھایا کہ یہی ہماری فوج کا سپہ سالار ہے۔ چنانچہ حاجی مراد گھوڑا بڑھا کر پرنس درنوخ کے پاس پہنچا' سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے سلام کیا اور تاتاری میں اس سے کچھ کہا۔

ایک قزاق کو مترجم کے طور پر بلایا گیا اور وہ دونوں کی گفتگو ایک دوسرے کو سمجھانے لگا۔

”حاجی مراد کہتا ہے کہ میں روس کے بادشاہ زار کی منشا پر خود کو سپرد کر رہا ہوں۔ بہت عرصہ سے میرا یہی ارادہ تھا مگر میرے اس عزم میں شمل حارج ہوتا رہا۔“

مترجم نے حاجی مراد کے کلمات کا ترجمہ پرنس درنوخ کو بتاتے ہوئے کہا۔

حاجی مراد کے الفاظ سن کر پرنس درنوخ نے مصافحہ کے لئے اپنا ہاتھ بڑھایا۔

حاجی مراد نے ایک لمحہ کے لئے ذرا توقف کیا پھر اس نے پرنس کا ہاتھ تھام لیا۔

اس کے بعد کچھ کہا۔

"حاجی مراد کہتا ہے کہ وہ خود کو سوائے آپ کے اور کسی کے ہاتھ میں دینا نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ آپ خود بھی سردار ہیں اور سردار کے لڑکے بھی ہیں۔"

مترجم نے پھر حاجی مراد کے کلمات کا ترجمہ کرتے ہوئے پرنس سے کہا۔

پرنس درنوخ نے سر کی جنبش سے اس کا شکریہ ادا کیا۔

"یہ کہتا ہے کہ میں اپنے تمام رفقا سمیت روسی حکومت کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔"

مترجم نے حاجی مراد کے الفاظ کا ترجمہ کرتے ہوئے کہا۔

پرنس درنوخ حاجی مراد کے رفقاء کی طرف مڑا اور ان کا بھی اس نے سر کی جنبش سے شکریہ ادا کیا۔

جب پرنس درنوخ اور حاجی مراد قلعہ میں پہنچے تو سپاہی حیرت سے دیکھنے لگے اور جمع ہو کر آپس میں رائے زنی کرنے لگے۔

"اس شخص نے کس قدر ہمارے آدمی قتل کئے ہیں اور اب دیکھنا اس کے کتنے چرچے ہوتے ہیں۔"

ایک سپاہی نے کہا۔

"ہونے ہی چاہئیں۔ ایک زمانے میں یہ شمل کا دست راست تھا۔"

دوسرا بولا۔

"سب کچھ سہی۔ یہ ہے بڑا جیوٹ۔ پکا غازی۔"

تیسرے نے کہا۔

اس کے بعد اور بہت سے سپاہی اپنے اپنے کام چھوڑ کر حاجی مراد کو دیکھنے کے لئے لپکے۔ ان کے افسر انہیں ڈانٹنے لگے۔

"آنے دو سپاہیوں کو وہ بھی اپنے پرانے دوست کو دیکھنا چاہتے ہیں۔"

درنوخ نے کہا۔

پھر ایک انگریزی داں افسر کی طرف مڑا اور اس سے بولا۔

"تم جانتے ہو یہ کون ہے؟"

"نہیں حضور والا۔"

افسر نے جواب دیا۔

"یہ حاجی مراد ہے۔ تم نے اس کا نام تو سنا ہو گا۔"

درنوخ نے کہا۔
"جی ہاں کیوں نہیں۔ کئی بار اس سے مقابلہ ہو چکا ہے۔"
افسر بولا۔
حاجی مراد سمجھ گیا تھا کہ وہ دونوں اس کے متعلق گفتگو کر رہے تھے۔

پرنس ورنوخ کو اس بات کی بے حد مسرت تھی۔ روسی حکومت کے ایسے خطرناک دشمن کو زیر کرنے کا سہرا اس کے سر تھا۔ لیکن ساتھ ہی پرنس کو ایک چیز کی تشویش بھی تھی۔ وہ یہ کہ جنرل میلر فوج کا سپاہ سالار اعظم تھا چنانچہ حاجی مراد کے متعلق تمام کارروائی اس کی معرفت عمل میں آنی چاہئے تھی' اسے اندیشہ تھا کہ جنرل میلر کے پاس حاجی مراد کی سپردگی کی رپورٹ نہ بھیجے کے سبب سے کوئی ناخوش گوار بات نہ پیدا ہو جائے۔

اس خیال کے آتے ہی اسے فکر سی لاحق ہو گئی۔ بہرحال حاجی مراد کو اپنے ہمراہ لے کر بنگلے میں آگیا۔

شہزادی ماریہ نے جو بہترین ملبوسات میں تھی مسکراتے ہوئے حاجی مراد کا استقبال کیا۔ شہزادی کا چھ سالہ خوب صورت بچہ بھی اس کے ساتھ تھا۔

حاجی مراد نے شہزادی ماریہ کو دیکھ کر حسب رسم سینے پر ہاتھ رکھ کر سلام کیا اور مترجم کے ذریعہ سے بات چیت ہونے لگی۔

"میں آپ کے شوہر پرنس ورنوخ کو اپنا قناق (مونہہ بولا بھائی) سمجھتا ہوں۔"

حاجی مراد نے شہزادی ماریہ سے کہا۔

حاجی مراد کی پروقار شخصیت اور اس کے مہذب اطوار سے ماریہ بہت خوش ہوئی اور اپنا سفید و حسین ہاتھ مصافحہ کے لئے اس نے بڑھایا۔

حاجی مراد غیر عورت کے جسم کو چھونے کا روا دار نہ تھا بہرحال اس نے ادب سے مصافحہ کیا۔

"بیٹھئے۔"

ماریہ نے ایک تخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حاجی مراد سے کہا۔

مترجم حق ترجمانی ادا کر رہا تھا۔

حاجی مراد بیٹھ گیا۔

"کافی پئیں گے آپ؟"

ماریہ نے دریافت کیا۔

چنانچہ فوراً کافی آگئی' لیکن حاجی مراد نے نہیں پی۔

حاجی مراد روسی زبان کچھ کچھ سمجھ تو لیتا تھا۔ مگر بولنے سے قاصر تھا۔ ماریہ کے جو الفاظ اس کی سمجھ میں نہ آتے ان کے جواب میں وہ صرف مسکرانے لگتا تھا۔

ماریہ کا خوب صورت بچہ جس کا نام بلقا تھا اپنی خوب صورت نیلی آنکھوں سے حاجی مراد کو دیکھے جا رہا تھا۔

اس بچے نے بھی جنگ جو حاجی مراد کا نام سنا تھا اور حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

حاجی مراد کو اپنی بیوی اور بچے کے پاس چھوڑ کر درنوخ اپنے آفس میں چلا آیا تھا کہ ملٹری ہیڈ کوارٹر میں بھیجنے کے لئے حاجی مراد کی رپورٹ پر غور کرے۔

غرض اس نے آفس میں بیٹھ کر رپورٹ لکھی اور ایک خط اپنے والد کو بھی لکھا' اس کے بعد جلدی سے بنگلے پر آگیا۔ مبادا اس کی بیوی حاجی مراد کی موجودگی سے اکتا رہی ہو۔

لیکن یہاں آکر پرنس نے فیملی کا سا پرمسرت سماں دیکھا۔

حاجی مراد ایک آرام کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور بلقا (پرنس کا بچہ) اس کے گھٹنے پر بیٹھا ہوا تھا اور مترجم کے ذریعہ حاجی مراد کے مزے مزے کی حکایات سنا رہا تھا۔

اس کے چہرے پر مسرت تھی اور بے تکلفی سے باتیں کر رہا تھا۔

ماریہ خوب ہنس رہی تھی۔

لیکن پرنس درنوخ کے داخل ہوتے ہی حاجی مراد ایک دم اٹھ کھڑا ہوا اور جلدی سے بلقا کو اپنے گھٹنے پر سے اتار دیا۔ اس کے بعد حاجی مراد کی خوش طبعی دفعتہً سنجیدگی سے بدل گئی۔ بہرحال جب درنوخ بیٹھ گیا تو حاجی مراد بھی اپنی جگہ پر جا بیٹھا۔

اس کے بیٹھتے ہی ننھا بلقا پھر اس کے گھٹنے پر آچڑھا۔

"یہ تو بڑے مزے کا آدمی ہے۔"

ماریہ نے مسکرا کر فرانسیسی میں (تاکہ حاجی مراد سمجھ نہ سکے) اپنے شوہر سے کہا پھر بولی۔

"بلقا کو اس کا پیش قبض بہت پسند آگیا تھا۔ چنانچہ وہ اس نے بلقا کی نذر کر دیا۔"

بلقا نے وہ پیش قبض اپنے والد کو بھی دکھایا۔

حاجی مراد بچے کے سنہری بالوں پر ہاتھ پھیرتا رہا۔

"بڑا خوب صورت پیش قبض ہے۔ میں تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں"

درنوخ نے حاجی مراد سے کہا۔

اور تیز پیش قبض کو تھوڑا سا نیام سے نکال کر دیکھا۔

حاجی مراد مسکرا کر چپ ہو گیا۔

"اس سے دریافت کرو کہ آیا اسے کسی چیز کی ضرورت ہے۔"

درنوخ نے مترجم سے کہا۔

مترجم نے تعمیل کی۔

"مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ لہٰذا مہربانی کر کے کوئی پاک جگہ بتا دی جائے۔"

حاجی مراد نے جواب دیا۔

چنانچہ اسے دور ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا۔

تنہائی میں آتے ہی حاجی مراد کا چہرہ دفعتہً تبدیل ہو گیا۔ اس کے چہرے سے وہ خوش طبعی، زندہ دلی کے اثرات ایک لخت مٹ گئے۔ اس کے بجائے اس کے بشرے سے کسی تشویش کے آثار نمودار ہونے لگے۔

اپنی توقع کے خلاف حاجی مراد نے پرنس درنوخ کو متواضع پایا تھا، اس سے وہ کھٹکا تھا۔ اسے یہ اندیشہ لاحق ہو گیا کہ درنوخ اور اس کے افسر اسے پھسلا رہے ہیں۔ یہ لوگ قابل اعتبار نہیں۔ ان سے کچھ بعید نہ تھا کہ اسے جیل میں ڈال دیں۔ سائبیریا بھیج دیں یا مار ڈالیں۔

چنانچہ اس نے سوچا کہ بہت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔

الدر سے حاجی مراد کی جب ملاقات ہوئی تو اس نے سب سے پہلا سوال اس سے یہی کیا کہ آیا اپنے تمام ساتھیوں سے ہتھیار لے لئے گئے ہیں اور یہ کہ ساتھیوں کو کس جگہ مقیم کیا گیا ہے۔

"ہتھیار تو اپنے ہی پاس ہیں اور ساتھیوں کو ایک مکان میں ٹھیرایا گیا ہے۔ اس وقت مترجم اسے کھانا کھلا رہا ہے۔"

الدر نے جواب دیا۔

"اور اپنے گھوڑے کہاں ہیں؟"

حاجی مراد نے دوسرا سوال کیا۔

"وہ پرنس درنوخ کے اصطبل میں بندھے ہوئے ہیں۔"

الدر نے کہا۔

حاجی مراد شبہات میں گھرا ہوا چپ ہو گیا۔

"اچھا میرا خنجر دے جاؤ۔"

حاجی مراد نے اس سے کہا۔

اس کے بعد اس نے نماز ادا کی پھر ایک دیوان پر بیٹھ کر وقت کا انتظار کرنے لگا کہ آئندہ کیا گل کھلتا ہے۔

چار بجے کے بعد مترجم داخل ہوا اور اس سے بولا

"چلئے پرنس کھانے پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

حاجی مراد بے دلی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

اس تواضع سے وہ کھٹک رہا تھا کہ اس کے عقب میں ضرور کوئی بھید ہے۔

اس نے سوائے تھوڑے سے پلاؤ کے بمشکل کسی دوسری چیز کو چھوا ہو گا اسے اس قدر کم کھاتا دیکھ کر ماریہ اپنے شوہر سے بولی۔

"یہ شائد ڈر رہا ہے کہ اسے کہیں ہم زہر نہ دے دیں۔"

حالانکہ حاجی مراد اور ماریہ نے ایک ہی پلیٹ میں کھایا تھا

اس کے بعد وہ مترجم کے ذریعہ حاجی مراد سے مخاطب ہوئی۔

"اب کس وقت آپ نماز پڑھیں گے؟"

حاجی مراد نے جواباً انگلیاں اٹھائیں اور آفتاب کی طرف اشارہ کیا۔

"پھر تو وقت قریب ہے۔"

پرنس درنوخ نے اپنی گھڑی نکال کر وقت دیکھا۔

سہ پہر کے سوا چار بجے تھے۔

حاجی مراد نے پہلے کبھی گھڑی نہیں دیکھی تھی۔ حیرت سے گھڑی کو دیکھنے لگا۔

"کیا میں اسے دیکھ سکتا ہوں۔"

حاجی مراد نے پرنس سے دریافت کیا۔

"یہ اسے تحفہ کے طور پر دے دو۔"

ماریہ نے فرانسیسی میں اپنے شوہر سے کہا۔

درنوخ نے پیش کر دی۔

حاجی مراد مسرت سے اسے دیکھنے لگا۔

کھانے کے تھوڑی دیر بعد جنرل میلر کا ایڈی سی اپنے جنرل کا (پرنس درنوخ کی رپورٹ کا جواب) جواب لے کر درنوخ کے پاس آیا۔

"حاجی مراد کو اپنے پاس بلانے کا حال پڑھ کر جنرل میلر آپ سے بہت خفا ہوئے ہیں کہ آپ نے ان سے مشورہ کیوں نہیں کیا۔ بہرحال اب جنرل نے حکم دیا ہے کہ حاجی مراد کو فوراً ان کے پاس بھیج دیا جائے۔" جنرل میلر کے اڈی سی نے پرنس درنوخ سے کہا۔

"جنرل کے حکم کی تعمیل ہو گی۔"

درنوخ نے کہا۔

اور مترجم کے ذریعہ حاجی مراد کو اطلاع دی کہ وہ جنرل میلر کے پاس جانے کے لئے تیار ہو جائے۔ ایڈی سی کے آنے کا مقصد معلوم ہونے کے بعد ماریہ کو فوراً خدشہ ہوا کہ اس کے شوہر اور جنرل میلر کے درمیان کشیدگی پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

چنانچہ درنوخ کے منع کرنے کے باوجود وہ بھی اپنے شوہر اور حاجی مراد کے ساتھ جنرل میلر کے پاس جانے کو تیار ہو گئی۔

"اس موقع پر تم نہ چلو، پھر کبھی چلنا۔"

درنوخ نے اپنی بیوی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"نہیں میں تو ابھی چلوں گی۔"

ماریہ اپنے اصرار پر اڑی رہی۔

آخر درنوخ کو ماننا پڑا اور تینوں (حاجی مراد۔ پرنس درنوخ اور ماریہ) جنرل میلر کے کیمپ کی طرف روانہ ہوئے۔

ماریہ کو دیکھ کر جنرل میلر نے اس کا خیر مقدم کیا اور اسے اپنی بیوی سے ملایا۔

پھر اپنی ایڈی سی بولا۔

"حاجی مراد کو کمرے میں بٹھاؤ اور جب تک میں حکم نہ دوں اسے باہر نہ نکلنے دیا جائے۔"

اس کے بعد پرنس درنوخ کو کرسی پیش کئے بغیر اس سے مخاطب ہوا۔

یہاں کی فوج کا اعلیٰ کمانڈر میں ہوں۔ دشمنوں سے تمام معاملات میری معرفت طے ہونے چاہئیں۔ تم نے میرے پاس فوراً رپورٹ روانہ کیوں نہیں کی کہ حاجی مراد آیا ہوا ہے؟"

جنرل نے پرنس درنوخ سے دریافت کیا۔

"میرے پاس حاجی مراد کا ایلچی آیا تھا۔ اس نے حاجی مراد کی جانب سے شرط ہی یہ رکھی تھی کہ حاجی مراد خود کو صرف میرے سپرد کرنے کو آمادہ ہو سکتا ہے۔"

درنوخ نے جواب دیا۔
پرنس کے چہرے پر غصے کے آثار پیدا ہو گئے۔
"لیکن میں یہ دریافت کرتا ہوں کہ تم نے مجھے کیوں نہیں اطلاع کی؟"
جنرل نے کہا
"میں آپ کو اطلاع دینے ہی والا تھا ——————
"مجھے حضور والا کہہ کر خطاب کرو۔"
جنرل نے پرنس کی بات کاٹ کر کہا۔
اس کے بعد جنرل میلر برس پڑا۔
پرنس کے خلاف اس کے سینے میں اب تک جتنا غبار بھرا ہوا تھا سب ابل پڑا۔
جنرل میلر نے کہا۔
"میں ستائیس سال سے اپنے بادشاہ کی خدمت اس لئے نہیں کر رہا ہوں کہ کل کے لونڈے اپنے خاندان کے اثرات کی بنا پر ترقی پا جائیں' اور میرے حکم کی خلاف ورزی کرنے لگیں۔"
"حضور والا میں آپ سے درخواست کروں گا کہ غلط بیانی سے کام نہ لیں۔"
پرنس درنوخ نے کہا۔
"میں غلط بیانی سے کام نہیں لے رہا ہوں۔ میں ہرگز اجازت نہیں دے سکتا کہ ——————"
جنرل میلر غضب ناک ہو کر کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ ماریہ داخل ہوئی' اس کے پیچھے میلر کی بیوی بھی تھی۔
"اوہو یہاں تو فضا بگڑی ہوئی ہے۔ مگر جنرل میرا شوہر آپ کو ناراض کرنے یہاں نہیں آیا ہے۔"
حسین ماریہ نے جنرل میلر کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھ کر کہا۔
اس حسینہ کو دیکھتے ہی جنرل میلر کا تمام غیض و غضب کافور ہو گیا۔
"نہیں پرنس ماریہ یہ بات نہیں ہے ——————"
جنرل میلر کے مونہہ سے نکلا۔
خیر خیر کوئی بھی بات سہی۔ قصہ ختم کیجئے۔ بری صلح بھی ایک اچھی لڑائی سے بہتر ہے لو میں کیا کہہ گئی۔"

ماریہ نے کہا۔
اور ہنسنے لگی۔
اس کی قاتلانہ ہنسی سے جنرل میلر بسل ہو گیا اور اس کی بڑی بڑی مونچھوں کے نیچے مسکراہٹ آگئی۔
"غلطی میری ہی ہے۔ لیکن ------"
پرنس درنوخ بولا۔
"نہیں میں بھی حد سے بڑھ گیا تھا۔"
جنرل میلر نے کہا۔
اور بڑھ کر پرنس درنوخ سے ہاتھ ملایا۔
چنانچہ ان دونوں میں مصالحت ہو گئی۔ بہرحال طے یہ پایا کہ حاجی مراد کو سردست جنرل میلر کی نگرانی میں چھوڑ دیا جائے۔ پھر اسے بائیں بازو کی افواج کے کمانڈر کے پاس بھیج دیا جائے گا۔
حاجی مراد پاس والے کمرے میں بیٹھا ہوا سب کچھ سن رہا تھا۔ ہرچند اس کی سمجھ میں ان لوگوں کی تمام گفتگو نہ آسکی مگر اپنے متعلق تمام باتیں وہ سمجھ گیا تھا۔
حاجی مراد نے اندازہ لگا لیا تھا کہ پرنس درنوخ اور جنرل میلر کے درمیان اسی کے متعلق جھگڑا ہو رہا تھا۔ اور اب دوسرے فوجی افسروں کے سپرد اسے کر دیا جائے گا جو یا تو اسے مار ڈالیں گے یا عمر قید کے طور پر اس کو سائبریا بھیج دیں گے۔
حاجی مراد یہ بھی جانتا تھا کہ اگرچہ جنرل میلر بڑا کمانڈر تھا مگر وہ اس قدر صاحب اثر نہیں ہے جس قدر پرنس درنوخ ہے۔ اسی سبب سے میلر کے مقابلے میں پرنس درنوخ کو زیادہ اہمیت حاصل تھی۔
حاجی مراد ان خیالات کے بعد تن کر کھڑا ہو گیا۔ اور خود سے کہنے لگا۔
میں اپنے پہاڑی علاقے سے صرف سفید فام "زار روس" کی خوشنودی کے لئے آیا ہوں۔ میں خود بھی اپنے قبیلے کا سردار ہوں' اس لئے ایک سردار ہی سے اپنا معاملہ رکھوں گا۔ کسی چھٹ بھیا کی غلامی نہیں کر سکتا۔ لہٰذا میں بڑے پرنس درنوخ (پرنس درنوخ کا والد جو کمانڈر انچیف تھا) ہی سے ملوں گا جس کا ہیڈ کوارٹر مفلس میں تھا۔

مائیکل درنوخ (پرنس درنوخ کا والد) برطانیہ کے روسی سفیر کا لڑکا تھا۔ اس نے برطانیہ میں ہی تعلیم بھی پائی تھی۔ فطرتاً وہ خوش اخلاق و مہذب انسان واقع ہوا تھا اور اپنے ماتحتوں کے ساتھ نرمی سے پیش آتا تھا۔

اپنی قابلیت اور ذہانت سے وہ بہت جلد ترقی کر گیا اور چند ہی سال میں ترقی کے انتہائی اوج پر جا پہنچا۔ وہ بڑا چالاک اور دلیر جنرل مشہور تھا۔ ایک معرکہ میں اس نے نپولین اعظم کو بھی شکست دی تھی۔

۱۸۵۲ء میں اس کی عمر ستر سال سے زیادہ ہو گئی تھی، لیکن صحت اچھی تھی۔ اس کی اپنی ذاتی جائداد بھی بہت بڑی تھی اور اس کی بیوی بھی (جو ایک شہزادی تھی) صاحب جائداد تھی۔ چنانچہ انہوں نے کریمیا کے جنوبی ساحل کے قریب ایک عالی شان محل بنوایا تھا۔

چار نومبر ۱۸۵۲ء کی شام کو اس کے طفلس والے محل کے آگے ایک گاڑی آکر رکی جس میں سے ایک تھکا ماندہ اور گرد و غبار میں اٹا ہوا افسر اترا۔

اس افسر کو جنرل کوزسکی نے حاجی مراد کی گرفتاری کی خبر لے کر مائیکل درنوخ کے پاس بھیجا تھا۔

شام کے چھ بج چکے تھے۔ کمانڈر انچیف درنوخ کھانے کے کمرے میں جا ہی رہا تھا کہ اسے اس آفیسر کے آنے کی اطلاع دی گئی۔

چنانچہ کمانڈر نے اسے فوراً طلب کر لیا۔

تھوڑی دیر بعد کمانڈر انچیف درنوخ کھانے کے کمرے میں داخل ہوا۔

یہاں تیس مہمان اس کا انتظار کر رہے تھے۔ ان میں کئی حسین شہزادیاں اور امیروں کی خوب صورت بیویاں، بیٹیاں بھی شامل تھیں۔ بہرحال درنوخ میز کے سامنے بیٹھ گیا اور اس کی بیوی دوسری طرف۔

"خیریت تو ہے۔ افسر کیا خبر لایا ہے؟"

درنوخ کی بیوی نے اس سے دریافت کیا۔

"اپنے بیٹے پرنس درنوخ کی کامیابی کے متعلق" درنوخ نے جواب دیا۔

اس کے بعد اس نے حاجی مراد کی سپردگی کا حال (جو ابھی آئے ہوئے آفیسر کی زبانی معلوم ہوا تھا) سنانا شروع کیا۔

درنوخ بولا۔

"حاجی مراد اپنے قبیلے کا بڑا بہادر اور مشہور شخص ہے۔ اس سے مصالحت کے مذاکرات کافی عرصے سے چل رہے تھے۔ مجھے خوشی ہوئی کہ اس نے خود کو روس حکومت کے حوالے کر دیا۔ اب وہ ایک دو روز میں طفلس آنا چاہتا ہے۔

مہمانوں میں سے ہر شخص خاموشی و دلچسپی سے حاجی مراد کے تذکرے کو سن رہا تھا۔

"کیا جنرل آپ کی بھی کبھی اس حاجی مراد سے ملاقات ہوئی ہے؟"

ایک شہزادی نے دریافت کیا۔

"کئی بار شہزادی۔"

بوڑھے جنرل درنوخ نے جواب دیا۔

پھر بولا۔

"حاجی مراد بڑا تیز اور بہادر آدمی ہے۔ ۱۸۴۸ء میں اس نے جرنیل ہم سے چھین لیا تھا اور جنرل پہلن کو شکست دے کر اس کے آدمیوں کو وہیں قتل کر دیا تھا۔"

"اچھا دوسری دفعہ کا واقعہ ہے کہ حاجی مراد نے ایک کمک کی پارٹی پر حملہ کر دیا تھا' اس میں پرنس درنوخ بھی شامل تھا۔ اگر فوراً ہی ہمارے پاس تازہ کمک نہ آ جاتی تو حاجی مراد ہم سب کا خاتمہ کر ڈالتا۔"

چونکہ یہ ایک مشہور واقعہ تھا۔ اس لئے تاہم حاضرین بالخصوص فوجی افسروں کو یاد آ گیا۔ کیونکہ اس میں روسیوں کو شدید نقصان اٹھانا پڑا تھا' ان کے بے شمار آدمی مارے گئے تھے اور حاجی مراد کی پہاڑی فوج نے ان کی توپیں بھی چھین لی تھیں۔

اس کے بعد حاجی مراد کے متعلق جس جس افسر کو کوئی واقعہ یاد تھا وہ سنانے لگا۔

ایک جارجیا کا پرنس' جو تھا تو احمق ٹائپ مگر اسے آداب خوب آتے تھے' بولا۔

"حاجی مراد ایک دفعہ عقمت خان کی بیوہ کو بھی اٹھا کر لے گیا تھا۔"

اس کے الفاظ کا بہت کم لوگوں نے یقین کیا۔

"لیکن اسے ایک بیوہ کو اٹھا کر لے جانے کی کیا ضرورت تھی؟"

ایک شہزادی نے دریافت کیا۔

"کیونکہ وہ حاجی مراد کے ایک دشمن کی بیوی تھی۔"

اسی احمق پرنس نے کہا۔

"لیکن میں نے تو سنا تھا کہ حاجی مراد اس کے ساتھ بڑی شرافت سے پیش آیا تھا اور بعد کو اس نے اسے رہا بھی کر دیا تھا۔"

پرنس درنوخ نے کہا۔

"ہاں تاوان لے کر۔"

وہ شخص بولا۔

غرض اس طرح اس دعوت میں حاجی مراد موضوع گفتگو بن گیا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ حاجی مراد نے تعمیر خاں کے گاؤں میں گھس کر دن دھاڑے دکانیں لوٹ لی تھیں۔

ایک آرمینیا کے افسر نے کہا۔

بہرحال حاجی مراد ایک عظیم شخصیت ہے' یہ ماننا پڑے گا۔

ایک مہمان نے کہا۔

"اگر وہ یورپ میں پیدا ہوتا تو نپولین ثانی ثابت ہوا۔"

اسی جارجیا کے احمق پرنس نے کہا۔

"نپولین تو کیا' ہاں البتہ ایک اچھا جنرل بن سکتا تھا۔"

درنوخ نے کہا۔

اس کے بعد کھانے پینے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

دوسرے روز جب حاجی مراد کمانڈرانچیف درنوخ کے محل میں لایا گیا تو اس کو دیکھنے کے لئے ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔

گذشتہ رات کو جو جنرل چڑھ چڑھ کر باتیں بنا رہا تھا وہ بھی آج اپنی مکمل فوجی وردی اور بڑی بڑی مونچھوں کو لئے وہاں موجود تھا۔

وہاں ایک اور کمانڈر بھی تھا جس نے سرکاری روپیہ میں غبن کیا تھا اور کورٹ مارشل کئے جانے کے خطرے میں مبتلا تھا۔ اس احتجاج میں ایک آرمینیا کا دولت مند سوداگر بھی موجود تھا جو ووڈکا (روسی شراب) کی اجارہ داری کا خواہاں تھا۔ اس کے علاوہ سیاہ لباس میں ایک فوجی افسر کی بیوہ بھی موجود تھی جس کا شوہر لڑائی میں مارا گیا تھا۔ وہ درنوخ کے پاس پنشن کی درخواست لے کر آئی تھی۔

اسی طرح ہال میں جارجیا کا ایک بگڑا ہوا تاجر بھی تھا جو گرجا کی املاک کو اپنے حق میں ضبط کئے جانے کی درخواست لے کر حاضر ہوا تھا۔

اس جگہ ایک تاتاری خان بھی موجود تھا جو یہاں محض اس لئے آیا تھا کہ اپنے پہاڑی قبیلے میں پہنچ کر فخریہ کہہ سکے کہ وہ پرنس درنوخ سے مل کر آ رہا ہے۔

غرض یہاں تمام قسم کے ضرورت مند موجود تھے جن کو پرنس باری باری سے شرف ملاقات بخش رہا تھا۔ لیکن جونہی حاجی مراد باوجود قدرے لنگ کے تیز گامی سے نمودار ہوا تو سب کی آنکھیں اس طرف لگ گئیں۔

اس نے اپنا نام لوگوں کی زبانوں پر سنا۔ وہ شاندار لباس میں ملبوس تھا۔ سر پر کلاہ تاتاری تھی اور جسم پر جبہ۔

نوجوان ایڈی سی نے اس کا خیر مقدم کیا۔

"تشریف رکھئے۔ میں آپ کے آنے کی اطلاع ابھی پرنس کے پاس کئے دیتا ہوں۔"

ایڈی سی نے اسے ایک کرسی پیش کرتے ہوئے کہا۔

لیکن حاجی مراد بیٹھنے کے بجائے کھڑا ہی رہا اور پیش قبض کے قبضہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین کو حقارت سے دیکھتا رہا۔

اس کے بعد ایک مترجم اس کے پاس آیا جس سے حاجی مراد نے رخ تک نہیں ملایا۔

آخر چند منٹ بعد پرنس کے روبرو اس کی طلبی کا پیام آگیا۔ اور وہ پرنس کے شاندار کمرے میں داخل ہوا۔

عظیم الشان میز کے سامنے پہنچ کر حاجی مراد حسب معمول تکریم بجا لایا۔ اس کے بعد اس نے کمیاک زبان میں صاف صاف گفتگو شروع کی۔

"میں خود کو باقتدار زار روس اور آپ کی نگرانی و حفاظت میں دیتا ہوں۔ اور اپنے خون کے آخری قطرے تک حکومت روس کی، وفاداری سے، خدمت کرنے کا وعدہ کرتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ میں شمیل کے خلاف جنگ میں بہت مفید ثابت ہوں گا۔ شمیل آپ کا بھی دشمن ہے، اور میرا بھی۔"

حاجی مراد نے لب کشائی کی۔

مترجم نے حاجی مراد کے کلمات کا ترجمہ بوڑھے پرنس درنوخ کو پیش کیا تو اس نے حاجی مراد کی طرف دیکھا اور حاجی مراد نے اس کی طرف۔

دونوں کی نگاہوں میں کوئی معنی پنہاں تھے جن کو الفاظ کا جامہ پہنانا مشکل تھا۔

پرنس درنوخ کی آنکھیں حاجی مراد سے کہہ رہی تھیں کہ مجھے تیرے ایک لفظ کا بھی یقین نہیں۔ کیونکہ تو روس کی ہر چیز کو اپنا دشمن سمجھتا ہے اگر تو مجبور نہ ہو گیا ہوتا تو کبھی خود کو ہمارے سپرد نہ کرتا۔

اسی طرح حاجی مراد کی آنکھیں پرنس درنوخ سے کہہ رہی تھیں۔

اے بڈھے تو میری موت کا خواہاں ہے۔ میری سپاہیانہ خدمات کا نہیں، تو ہے تو بوڑھا۔ مگر بڑا چالاک واقع ہوا ہے۔ چنانچہ خبردار رہنا چاہئے۔

درنوخ کو بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کے متعلق حاجی مراد کے دل میں کیا خیالات وارد ہو رہے ہیں۔

بہرحال درنوخ مترجم سے بولا۔

"اس سے کہو کہ ہمارا بادشاہ اتنا ہی رحمدل ہے جتنا کہ وہ صاحب سطوت ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمارا شہنشاہ اسے میری سفارش پر معاف کر دے گا اور اسے خدمت کا موقع بخشے گا"

اس کے بعد اس نے حاجی مراد کی طرف دیکھا۔

پھر مترجم سے مخاطب ہوا۔

"اس سے یہ بھی کہو کہ شہنشاہ کا اس کے متعلق کوئی حکم نامہ آنے تک اس کی

مدارات میرے ذمہ ہے۔"

حاجی مراد نے پھر سینے پر ہاتھ رکھ کر آداب کیا اور کچھ کہا۔

"یہ کہہ رہا ہے۔"

مترجم نے درنوخ سے مخاطب ہو کر کہا۔

۱۸۳۹ء میں جب کہ میں عواریہ کا حاکم تھا تو اس زمانے میں بھی میں نے وفاداری سے روسی گورنمنٹ کی خدمت کی تھی۔ اگر میرا دشمن عقمت خان میرے درپے آزار نہ ہو جاتا تو میں کبھی روسی حکومت کی وفاداری سے مونہہ نہ موڑتا۔

"ہاں مجھے سب کچھ یاد ہے۔"

پرنس درنوخ نے کہا اور حاجی مراد کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

مگر وہ کھڑا ہی رہا۔

"عقمت خاں اور شمیل دونوں میرے دشمن ہیں۔ ان میں سے عقمت خاں تو چل بسا اس سے تو میں اب انتقام نہیں لے سکتا۔ شمیل ابھی زندہ ہے چنانچہ میں جیتے جی اس سے انتقام لئے بغیر نہ رہوں گا۔"

حاجی مراد نے ابرو پر بل ڈال کر کہا۔

"اس سے کہو۔" پرنس درنوخ مترجم سے بولا۔

"کہ شمیل سے انتقام لینے کی یہ کیا تدبیر کرے گا۔ اچھا اس سے بیٹھ جانے کو بھی کہو۔"

لیکن حاجی مراد نے اس بار بھی بیٹھنے سے انکار کیا۔

"یہاں میرے آنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ میں شمیل کی تباہی میں روسی حکومت کی مدد کروں۔"

"بہتر ہے۔ لیکن اس باب میں آخر تمہارا کوئی لائحہ عمل تو ہو گا۔"

درنوخ نے مترجم کے ذریعہ سے حاجی مراد سے دریافت کیا۔

"مجھے تھوڑی سی فوج دی جائے پھر میں شیغان پر قابض ہو کر شمل کا خاتمہ کر دوں گا۔"

حاجی مراد نے جواب دیا۔

"اچھا میں اس پر غور کروں گا۔"

پرنس درنوخ نے کہا۔

حاجی مراد خاموش ہو گیا، آخر بولا۔

"سردار صاحب سے کہو کہ میری نیلی میرے دشمن کے قبضے میں ہے۔ جب تک وہ پہاڑی علاقہ میں شمل کے قبضے میں ہے، میں بے دست و پا ہوں۔ شمل میری بیوی (نیلی) کو مار ڈالے گا اور میری والدہ اور میرے بچوں کو بھی زیادہ نہ چھوڑے گا، اس لئے میں علانیہ اس کے مقابلے کو نہیں جا سکتا۔ چنانچہ پرنس سے درخواست کروں گا کہ آپ کے ہاں کے قیدیوں سے میری نیملی کا تبادلہ کر لیں، اس کے بعد میں شمل سے نبٹ لوں گا۔ یا تو اسے تباہ کر دوں گا۔ یا خود مر جاؤں گا۔"

پرنس درنوخ نے کہا۔

"بہتر ہے میں غور کروں گا، اچھا اب تم جا کر چیف آف اسٹاف سے ملو اور جو کچھ تمہارا پلان ہے، اس کو بتاؤ۔"

غرض ان دونوں کی یہ پہلی ملاقات ختم ہو گئی۔

دوسرے روز حاجی مراد ایک اٹلی کے اوپیرا میں مدعو کیا گیا۔ یہاں پرنس درنوخ بھی موجود تھا۔

حاجی مراد اپنی اسلامی سادگی سے شامل ہوا' لیکن اس نے گاجے باجے میں کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا بلکہ چند منٹ بعد ہی اٹھ کر چلا گیا۔

لوگ اسے دیکھنے لگے۔

اگلے دن پیر تھا' اور پیر کو بھی شام کے وقت پرنس درنوخ کے محل میں پارٹی تھی۔ جس میں فوجی حکام۔ معززین اور خواتین کا اجتماع تھا۔

بہت وسیع اور جگمگاتے ہال میں سریلا بینڈ بج رہا تھا۔ نوجوان و حسین عورتیں جن کے سڈول بازو اور سینے کھلے ہوئے تھے۔ مردوں سے لپٹ کر ڈانس کر رہی تھیں۔

زرق برق لباس پہنے ہوئے ملازمین ادھر ادھر دوڑے پھر رہے تھے اور خواتین کو شمپین اور مٹھائی پیش کرنے میں لگے ہوئے تھے۔

سردار کی بیوی (بوڑھے کمانڈرانچیف پرنس درنوخ کی اہلیہ بھی باوجود اپنی عمر بانختگی کے شاہانہ لباس میں ملبوس مہمانوں کی تبسم سے تواضع کر رہی تھی اس نے مترجم کے ذریعہ سے حاجی مراد سے بھی چند کلمات ادا کئے۔

حاجی مراد اس عیش و عشرت کی فضا میں بھی اسی قدر عدم دلچسپی کا اظہار کر رہا تھا' جس طرح کل اس نے تھیٹر میں کیا تھا۔

دوسرے مہمانوں کے بعد چند نیم عریاں عورتیں اس کے قریب آئیں اور بے حیائی سے اس کے پاس مسکراتی آکھڑی ہوئیں اور کچھ سوالات کرنے لگیں۔

"کہئے آپ کو یہ مناظر پسند آئے؟"

ایک نے اٹھلا کر حاجی مراد سے دریافت کیا۔

پرنس درنوخ بھی لباس فاخرہ پہنے ہوئے اس کے قریب آیا' اور اس نے بھی اس سے یہی سوال کیا۔

اس کا خیال تھا کہ حاجی مراد اس عیش و نشاط کی فضا سے مرعوب ہو رہا ہو گا اور دل میں اسے بے حد پسند کر رہا ہو گا۔

مگر اس پر اس محفل کا کوئی اثر نہ ہوا۔

"ہمارے ہاں یہ طریقے نہیں ہیں۔"

درنوخ کے سوال کے جواب میں حاجی مراد نے کہا۔

اس نے یہ نہیں بتایا کہ سفید فام روسیوں کی اس عریاں تصویر کو آیا اس نے پسند کیا یا ناپسند۔

آپ میری فیملی کو شمل کے پنجے سے جلد رہائی دلوایئے۔"

حاجی مراد نے درنوخ سے یہاں بھی اپنے دل سے لگی ہوئی درخواست کی۔

مگر وہ سنی ان سنی کرکے چلا گیا۔

اے ڈی سی نے حاجی مراد سے کہا۔

"اس قسم کی گفتگو کا یہ محل نہ تھا۔"

رات کے جب گیارہ بج گئے تو حاجی مراد نے درنوخ کی نذر کی ہوئی قیمتی گھڑی میں ٹائم دیکھ کر اے ڈی سی کو قریب بلایا۔

"کیا میں اب جا سکتا ہوں؟"

اس نے اے ڈی سی دریافت کیا۔

"ہاں شوق سے"

اے ڈی سی نے جواب دیا۔

پھر بولا۔

"لیکن بہتر یہی تھا کہ آپ بھی جانے کا قصد نہ کرتے۔"

لیکن حاجی مراد نہیں رکا۔

اس کے لئے ایک گاڑی وقف کر دی گئی تھی، اس میں بیٹھ کر اپنی جائے قیام پر روانہ ہوا۔ یہ جلسہ لیکن کئی گھنٹے تک جما رہا۔

بوڑھے کمانڈرانچیف پرنس درنوخ کے پاس طفلس میں آئے ہوئے حاجی مراد کو پانچ روز گزر گئے۔ آخر پانچویں روز درنوخ کا اے ڈی سی حاجی مراد کی قیام گاہ پر آیا۔

"میں پرنس کا فرماں بردار ہوں۔ کیا حکم ہے مجھے؟"

حاجی مراد نے بدستور ڈپلومیسی سے کام لیتے ہوئے اے ڈی سی سے دریافت کیا۔

اے ڈی سی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ تاتاری زبان اچھی طرح جانتا تھا چنانچہ حاجی مراد سے مخاطب ہوا۔

"حالانکہ پرنس درنوخ آپ کی پوری پچھلی ہسٹری سے واقف ہیں۔ مگر پھر بھی آپ کی مکمل روائیداد خود آپ سے سننا چاہتے ہیں۔

حاجی مراد خاموش ہو گیا۔

"آپ بولتے جائیے میں لکھتا جاؤں گا۔ پھر اس کا ترجمہ پرنس کے سامنے پیش کر دوں گا جو آپ کی ہسٹری کو شہنشاہ زار روس کے پاس روانہ کر دیں گے۔"

حاجی مراد خاموش بیٹھا رہا۔

جب اے ڈی سی ختم کر چکا تو اس نے سر اٹھایا اور اسی طرح مسکرایا جس سے ماریہ بھی متاثر ہوئی تھی۔

"مناسب ہے۔"

آخر اس نے کہا۔

اور دل میں خوش ہوا کہ اس کے حالات زندگی صاحب سطوت زار کی نظر سے گزریں گے۔

"اچھا تو بولتے جاؤ۔ شروع سے اپنے حالات بیان کرو۔"

اے ڈی سی نے کہا۔

اور جیب سے ڈائری نکالی۔

"کہاں تک سناؤں گا۔ میری داستان تو بہت طویل ہے۔"

حاجی مراد نے کہا۔

اے ڈی سی بولا۔

بوڑھے کمانڈر انچیف پرنس درنوخ کے پاس تفلس میں آئے ہوئے حاجی مراد کو پانچ روز گزر گئے۔ آخر پانچویں روز درنوخ کا اے ڈی سی حاجی مراد کی قیام گاہ پر آیا۔

"میں پرنس کا فرماں بردار ہوں۔ کیا حکم ہے مجھے؟"

حاجی مراد نے بدستور ڈپلومیسی سے کام لیتے ہوئے اے ڈی سی سے دریافت کیا۔

اے ڈی سی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ تاتاری زبان اچھی طرح جانتا تھا چنانچہ حاجی مراد سے مخاطب ہوا۔

"حالانکہ پرنس درنوخ آپ کی پوری پچھلی ہسٹری سے واقف ہیں۔ مگر پھر بھی آپ کی مکمل روائیداد خود آپ سے سننا چاہتے ہیں۔

حاجی مراد خاموش ہو گیا۔

"آپ بولتے جائیے میں لکھتا جاؤں گا۔ پھر اس کا ترجمہ پرنس کے سامنے پیش کر دوں گا جو آپ کی ہسٹری کو شہنشاہ زار روس کے پاس روانہ کر دیں گے۔"

حاجی مراد خاموش بیٹھا رہا۔

جب اے ڈی سی ختم کر چکا تو اس نے سر اٹھایا اور اسی طرح مسکرایا جس سے ماریہ بھی متاثر ہوئی تھی۔

"مناسب ہے۔"

آخر اس نے کہا۔

اور دل میں خوش ہوا کہ اس کے حالات زندگی صاحب سطوت زار کی نظر سے گزریں گے۔

"اچھا تو بولتے جاؤ۔ شروع سے اپنے حالات بیان کرو۔"

اے ڈی سی نے کہا۔

اور جیب سے ڈائری نکالی۔

"کہاں تک سناؤں گا۔ میری داستان تو بہت طویل ہے۔"

حاجی مراد نے کہا۔

اے ڈی سی بولا۔

"اگر تم ایک دن میں ختم نہ کر سکو تو دو تین روز تک بیان جاری رکھ سکتے ہو"

حاجی مراد نے دریافت کیا۔

"اچھا تو کیا بالکل ابتدا سے سناؤں؟"

اے ڈے سی نے جواب دیا۔

"ہاں بالکل شروع سے کہ کہاں پیدا ہوئے تھے۔ کیا کیا کام کرتے رہے کہاں رہے، وغیرہ۔"

حاجی مراد نے سر جھکا لیا اور بحر تفکر میں ڈوب گیا۔ پھر اس نے ایک قریب میں پڑی ہوئی لکڑی اٹھائی اور چاقو نکال کر اسے چھیلنے لگا۔

اس طرح لکڑی کو چھیلتا جاتا تھا اور بولتا جاتا تھا۔

" سلنیز جو ایک چھوٹا سا تاتاری گاؤں ہے' اس میں پیدا ہوا تھا۔ جتنا بڑا گدھے کا سر ہوتا ہے۔ ہم پہاڑی لوگ اسی قسم کی مثال دیا کرتے ہیں۔

حاجی مراد نے لکھوانا شروع کیا

پھر بولا

"میرے گاؤں سے دو توپوں کے گولے کے فاصلے پر خنزخ ہے۔ وہاں خان رہتا ہے (خان سردار کو کہتے ہیں) ہمارا خاندان اسی سے متعلق ہے۔"

جب میرا سب سے بڑا بھائی عثمان پیدا ہوا تھا تو بڑے سردار کو میری ہی ماں نے دودھ پلایا تھا۔ پھر اس نے خان کے دوسرے لڑکے عما خاں کو بھی دودھ پلایا۔ لیکن اس دوران میں میرے بڑے بھائی عصمت خاں کا انتقال ہو گیا۔ پھر جب میں پیدا ہوا اور اسی زمانے میں خان کا تیسرا لڑکا بلخ خان بھی تولد ہوا تو اس دفعہ میری ماں نے اسے دودھ پلانے سے انکار کر دیا حالانکہ میرے والد نے والدہ کو بہت مجبور کیا مگر وہ آمادہ نہیں ہوئیں۔

اماں نے صاف کہہ دیا کہ مجھے اپنے بچے کو مار ڈالنا گوارا ہے' مگر اس بار خان کے لڑکے کو دودھ نہیں پلاؤں گی۔ یہ سن کر میرے والد کو اتنا غصہ آیا کہ انہوں نے اماں کو پیٹنا شروع کر دیا۔ وہ انہیں جان ہی سے مار ڈالتے لیکن لوگوں نے بچا لیا۔ اماں نے یہ سب کچھ میری مامتا میں کیا تھا۔ اسی واقعہ پر اماں نے ایک گیت بھی جوڑا تھا۔ خیر اسے سنانے کی کیا ضرورت ہے۔"

اے ڈی سی نے کہا۔

"نہیں آپ کو سب کچھ سنانا ہے۔"

حاجی مراد سوچنے لگا۔ اسے اپنی ماں کا خیال آ رہا تھا کہ کتنے لاڈ سے سمور کے کوٹ میں لپیٹ کر اسے سلایا کرتی تھی۔

"میں بڑا ہو کر ماں کے جسم کا وہ زخم دیکھا کرتا تھا جو میری مدافعت میں انہوں نے ابا کے ہاتھوں کھایا تھا۔"

حاجی نے کہنا شروع کیا' پھر اپنی والدہ کا بنایا ہوا یہ گیت یاد کر کے سنایا (اس کے والد نے اپنی بیوی کے خنجر مارا تھا)

چمکیلے خنجر نے میرا سفید سینہ چھید ڈالا تھا
لیکن میں نے اپنے چاند کو اپنے لال کو اس پر لٹا دیا۔
یہاں تک کہ میرے سرخ خون سے اس کا جسم رنگ گیا۔
اور میرا زخم بغیر کسی مرہم کے آپ بھر گیا۔
میں موت سے نہیں ڈرتی اسی طرح میرا بچہ بھی موت سے نہیں ڈرے گا۔

حاجی مراد نے کہا۔

میری پیاری ماں' افسوس ہے آج کل ظالم شمل کے چنگل میں ہے' جہاں سے اس کو رہائی دلانے کے لئے میں سخت بے چین ہوں۔

اس کے بعد اس کو اپنے بچپن کا زمانہ یاد آیا اور وہ اپنے پہاڑی وطن کے در و دیوار اس کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے کہ کس طرح اپنی ماں کے لمبے تاتاری کرتے کا دامن تھامے ہوئے بچپن میں پانی لینے کے لئے پہاڑی کے نیچے فوارے کے پاس جایا کرتا تھا۔

پھر اسے عقیقے کی تقریب کا نقشہ یاد آیا۔ اس کی والدہ نے پہلی بار اس کا سرمنڈوایا تھا اور وہ آئینے میں اپنی منڈی ہوئی چمکتی کھوپڑی کا عکس دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔

اسے اپنے ایک پالتو مریل سے کتے کا دھیان آیا جو محبت سے اس کے ہاتھ اور پاؤں چاٹا کرتا تھا۔ اس کی ماں دودھ سے گوندھ کر اس کے لئے ٹکیہ پکاتی تھی۔ اس کا تھوڑا حصہ وہ چپکے سے اپنے کتے کو بھی کھلا دیا کرتا تھا۔ پھر وہ بالکل ننھا سا تھا تو اس کی والدہ اسے ایک ٹوکری میں بٹھا کر کمر سے باندھ لیا کرتی تھی اور دور اپنے والد (حاجی مراد کے نانا) کے پاس لے جاتی تھی اسے اپنے بوڑھے نانا کی شکل بھی یاد آئی کہ ان کا تمام چہرہ کس قدر جھریوں سے بھرا ہوا تھا اور ان کے بال سفید برف کی مانند تھے مگر اس کے باوجود بھی ان میں کتنی طاقت تھی۔

دفعتہ" حاجی مراد اپنے خیالات سے چونکا۔

سرہلایا پھر اے ڈی سی سے بولا۔

"خیر اچھا لکھو۔ میری ماں خان کے بچے کو دودھ پلانے نہیں گئی چنانچہ خانشہ (خان کی بیوی) نے دوسری دایہ کا انتظام کر لیا' لیکن خانشہ پھر بھی میری والدہ کی قدر و منزلت کرتی تھی۔ ہم بچے اپنی والدہ کے ساتھ خانشہ کے محل میں جایا کرتے تھے اور خانشہ کے بچوں کے ساتھ کھیلا کرتے تھے۔

خان کے تین بچے تھے ابو نطل خاں' میرے بھائی عثمان کا دودھ شریک برادر امّا خاں اور بلخ خان جسے شمل نے پہاڑی پر سے لڑھکا دیا تھا۔

"میری عمر سولہ سال کی ہو گی کہ ہمارے مرید آنے لگے تھے۔ وہ پتھروں کو کچلتے اور نعرہ بلند کرتے۔"

تمام مسلمان غازی ہوتے ہیں۔ اب شیشین اور عادار قبائل بھی اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے تھے۔

میں اس زمانے میں محل کے اندر خان کے لڑکوں کے ساتھ شہزادہ کی مانند رہتا تھا اور اپنی مرضی کا مالک تھا۔

میرے پاس دولت بھی جمع ہو گئی' جس سے میں نے گھوڑے اور ہتھیار خریدے۔
غرض میری زندگی بڑی بے فکری کی گزر رہی تھی۔ اپنے حال میں مست تھا اس طرح وقت گزر رہا تھا یہاں تک کہ قاضی ملا (جو امام تھا) مارا گیا' اور ہم زاد اس کا جانشین ہوا۔

جانشین ہوتے ہی ہم زاد نے خان کو چیلنج کیا کہ اگر اس نے غزوات میں حصہ نہیں لیا تو وہ اس کے محل کو تباہ کر دے گا۔

معاملہ ٹیڑھا آ پڑا تھا۔ خان کو روسیوں کا خوف علیحدہ ہوا تھا اور ساتھ ہی جہاد میں شرکت کرنے سے بھی ڈرتا تھا۔

آخر عما خان کو خانشہ نے مجھے بلانے کے لئے بھیجا چنانچہ چند روز بعد میں اور عما خان طفلس روانہ ہوئے تاکہ روسی کمانڈر انچیف سے ہم زاد کے خلاف مدد حاصل کریں۔

اس زمانے میں طفلس کے اندر نواب روزین کمانڈر انچیف تھا۔ اس نے مجھے اور عما خان کو شرف ملاقات نہیں بخشا۔ صرف اتنا کہلا بھیجا کہ وہ مدد روانہ کرے گا مگر اس نے کوئی مدد روانہ نہیں کی۔ ایک مذاق یہ رہا کہ روزین کے ایک افسر نے آ کر عما خان کے ساتھ تاش کھیلنے شروع کر دئے۔

پھر اس افسر نے اسے خوب شراب پلائی اور کسی خراب جگہ لے گیا جہاں تاش بازی میں عما خاں اپنا سب کچھ ہار گیا۔

عما خاں حالانکہ بڑا قوی ہیکل نوجوان تھا مگر بزدل واقع ہوا تھا۔ اگر میں مانع نہ ہو جاتا تو وہ اپنا گھوڑا اور ہتھیار بھی بازی پر لگا کر ہار جاتا۔

طفلس سے لوٹ کر میں بہت ہی بد دل ہوا۔ روسیوں کے طرز عمل کا مجھ پر ناگوار اثر پڑا۔ چنانچہ وطن واپس آ کر میں نے خانشہ اور خان کو یہی مشورہ دیا کہ وہ جہاد میں شرکت کر لیں۔

اے ڈی سی نے سوال کیا۔

"تمہارے خیالات میں یہ تبدیلی کیوں واقع ہوئی تھی؟ کیا تمہیں روسیوں سے نفرت ہو گئی تھی؟"

حاجی مراد نے قدرے توقف کے بعد جواب دیا۔

"نفرت تو کیا لیکن میں نے روسیوں کو پسند نہیں کیا' اس کے علاوہ ایک سبب اور تھا جس نے مجھے جہاد کی شرکت کے لئے اکسایا تھا۔"

اے ڈی سی نے دریافت کیا۔

"وہ کیا سبب تھا؟"

حاجی مراد نے کہا۔

"ہوا یہ تھا کہ راستے میں ہمیں تین مجاہد ملے۔ میں نے اور خان نے ان کا مقابلہ کیا۔ ان میں سے دو تو بچ نکلے۔ لیکن تیسرے کو میں نے بندوق کا نشانہ بنا دیا اور وہ خاک و خون میں گر گیا۔ جب میں اسلحہ چھیننے کے لئے اس کے پاس پہنچا تو اس نے شجاعانہ آنکھیں کھولیں اور اس کے لبوں پر ایک معصومانہ مسکراہٹ آ گئی اس کے بعد نقیہہ آواز میں مجھ سے بولا۔

"شکر ہے مجھے شہادت نصیب ہوئی۔ تو بھی مسلمان نوجوان ہے۔ اس لئے تجھے بھی جہاد میں شریک ہونا چاہئے۔ اس سے تجھ پر خدا کی رحمتیں نازل ہوں گی۔"

اے ڈی سے نے پوچھا۔

"پھر کیا تم شریک جہاد ہو گئے؟"

حاجی مراد نے جواب دیا۔

"افسوس میں جہاد میں شریک نہ ہوا۔ مگر اس شہید مجاہد کے الفاظ میرے کانوں میں گونجتے رہے اور میں کئی روز تک شرکت جہاد کے مسئلہ پر غور کرتا رہا۔"

حاجی مراد کہتا رہا ------

"خیر ہم نے اور خان نے امام ہمزاد کے پاس پیغام بھیجا کہ ہم اس شرط پر شریک جہاد ہو سکتے ہیں کہ تم کسی عالم کو ہمارے پاس بھیجو تاکہ وہ ہمیں جہاد کے متعلق کچھ بتائے۔"

اس کے جواب میں امام ہمزاد نے ہمارے قاصدوں کی مونچھیں منڈوا ڈالیں اور ان کی ناک چھید کر اس میں کیک ٹکڑے لٹکا دیئے۔

غرض اس نے ہمارے قاصدوں کی یہ درگت بنائی۔

بہرحال قاصدوں نے ہم سے کہا کہ امام ہمزاد ہمارے پاس ایک شیخ کو روانہ کرنے کے لئے آمادہ ہو گیا ہے۔ تاکہ وہ آکر ہمیں مذہبی باتیں بتائے اور جہاد کی تلقین بھی کرے۔ لیکن امام نے یہ شرط رکھی ہے کہ خان کو اپنا چھوٹا لڑکا ضمانت کے طور پر اس کے پاس چھوڑنا پڑے گا۔

خانشہ اور خان نے امام کی یہ شرط قبول کر لی اور اس کے پاس اپنے چھوٹے بیٹے بلخ خاں کو بھیج دیا۔

ہمزاد نے اس کا خیر مقدم کیا اور اس کے دونوں بڑے بھائیوں کو بھی بلوا بھیجا اور

خانشہ کو یقین دلایا کہ جس طرح اس کے والد (امام ہمزاد کا والد) نے خان کے خاندان کی خدمت کی ہے وہ بھی کرے گا۔

خانشہ ایک بے وقوف عورت واقع ہوئی تھی۔ جس طرح تمام عورتیں بے وقوف ہوتی ہیں۔ بہرحال اس نے اپنے دونوں لڑکوں کو تو نہیں بھیجا مگر ایک کو بھیج دیا جس کا نام عما خاں تھا۔

میں بھی اس کے ساتھ چلا گیا۔

ہمارے استقبال کے لئے ایک میل کے فاصلے پر مجاہدین کا دستہ آیا جس نے ہمیں گھیر کر گانا شروع کیا۔ اور نعرے مارنے لگے۔

تھوڑی دیر کے بعد خود امام ہمزاد بھی اپنے خیمے سے نکل آیا اور اس نے عما خاں کا ایسا ہی استقبال کیا جیسا اس کے باپ خان کا کرتا تھا۔

"مجھ سے آپ کے خاندان کو کبھی کوئی ایذا نہیں پہنچی اور نہ پہنچے گی۔"

ہمزاد نے عما خاں کے گھوڑے کی باگ تھام کر کہا۔

پھر بولا۔

"چنانچہ آپ بھی مجھے اور میرے آدمیوں کو جہاد کی شرکت سے نہ روکئے۔ اس کے حملہ میں میری تمام فوج آپ کی خدمت گذار رہے گی، جس طرح آپ کے والد کی رہی تھی۔ آپ ہمیشہ میری نصیحتوں سے فائدہ اٹھاتے رہیں گے؟

عما خان کو بات کرنے کا سلیقہ نہ تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دے۔ چپ ہو گیا۔ چنانچہ اس کے بجائے مجھے بولنا پڑا۔

میں نے کہا۔

"اگر آپ کے الفاظ میں صداقت ہے تو آپ خانشہ اور خان کے پاس آیئے۔ وہ ہاتھوں ہاتھ آپ کو لیں گے۔"

میں اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ روک دیا گیا۔ بس یہیں سب سے پہلے شمل سے میری مڈ بھیڑ ہوئی تھی۔ شمل بھی اس وقت امام کے قریب کھڑا ہوا تھا اس نے مجھے ٹوکتے ہوئے کہا۔

"تو کیوں درمیان میں دخل دیتا ہے۔ بات خاں سے کی جا رہی ہے۔"

مجھے خاموش ہو جانا پڑا۔ عما خان کو ہمزاد اپنے خیمہ میں لے گیا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے بھی خیمہ میں طلب کیا گیا اور امام نے مجھے حکم دیا۔

کہ اس کے (امام کے) آدمیوں کو لے کر بڑے خان کے پاس جاؤں۔ مجھے جانا پڑا۔
میں امام کے آدمیوں کے ہمراہ خان کے پاس پہنچا۔ ان آدمیوں نے خان کو ترغیب دینا
شروع کیا کہ وہ اپنے سب سے بڑے لڑکے کو بھی امام کے پاس بھیج دے۔
اب مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے بھانپ لیا تھا کہ اس میں کوئی چال ہے چنانچہ خان و
خانشہ سے بولا۔
"اپنے بڑے لڑکے کو نہ بھیجئے۔"
لیکن جیسا کہ میں نے ابھی کہا تھا کہ خانشہ ایک بے وقوف عورت تھی۔ عورت کے
سر میں اتنی ہی عقل ہوتی ہے۔ جتنی انڈے پر بالوں کا ہونا اگر ممکن ہے اس نے اپنے
سب سے بڑے لڑکے ابو نطل کو بھی حکم دیا کہ امام کے پاس چلا جائے۔
ابو نطل بولا۔
"میں نہیں جانا چاہتا اماں"
ماں نے خفا ہو کر اس سے کہا۔
"تو بزدل ہے۔"
وہ بھی جانتی تھی کہ بھڑ کی طرح اپنے بیٹے کے کون سے مقام پر ڈنک مار سکتی ہے۔
اس کے ان کلمات سے ابو نطل کو غصہ آگیا اور اس کی غیرت جوش میں آگئی۔
ماں سے تو اس نے کچھ نہ کہا مگر سائیس کو حکم دیا کہ اس کا گھوڑا تیار کرے۔ میں پھر
اس کے ساتھ بھی امام ہمزاد کے پاس پہنچا۔
اس بار امام اور بھی زیادہ تپاک سے پیش آیا۔ بہت ادب سے اس نے ابو نطل کا خیر
مقدم کیا۔ اسم کی تمام پارٹی بھی آگئی اور جس طرح پہلے انہوں نے عما خاں کو دیکھ کر گانا
اور نعرے مارنا شروع کیا تھا۔ اس دفعہ بھی یہی کیا۔
جب ہم کیمپ پر پہنچے تو امام ہمزاد ابو نطل کو بھی اپنے خیمے میں لے گیا۔
میں باہر ہی روک دیا گیا۔ ابھی میں کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ میں نے ہمزاد کے خیمے میں
بندوق کا دھماکا سنا۔
لپک کر خیمے میں آیا تو بڑا دردناک منظر دیکھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ عما خان خون میں نہایا
ہوا زمین پر تڑپ رہا ہے اور اس کا بڑا بھائی ابو نطل امام ہمزاد کے آدمیوں سے مصروف
جنگ ہے۔
ابو نطل کا ایک طرف کا کلا کٹ گیا تھا اور لٹک پڑا تھا۔

ایک ہاتھ سے اس نے اپنے کٹے ہوئے گلے کو تھام رکھا تھا' اور دوسرے ہاتھ سے خنجر بکف لڑ رہا تھا۔

ابو نطل نے امام ہمزاد کے بھائی کو مار گرایا اور دوسرے شخص پر وار کرنے ہی والا تھا کہ ہمزاد کے ایک آدمی نے بندوق داغ کر اس کا بھی کام تمام کر دیا۔"

اتنا کہہ کر حاجی مراد رک گیا۔

دھوپ میں جھلسا ہوا اس کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

"امام ہمزاد اور اس کے آدمیوں میں جذبہ جہاد نہ تھا بلکہ مکروہ جذبات عناد و انتقام ان کے سینوں میں بھرے ہوئے تھے۔"

بہرحال حاجی مراد نے سر اٹھایا پھر اندوہ گیں لہجہ میں بولا۔

خان کے دونوں گوشہ جگر کا خون دیکھ کر مجھ پر خوف طاری ہو گیا اور میں وہاں سے فرار ہوا۔

اے ڈے سی نے کہا۔

"واقعی؟ میں تو سمجھتا ہوں کہ تم خوف و ہراس سے کوسوں دور ہو۔"

حاجی مراد بولا۔

"ہاں زندگی میں یہ پہلی بار مجھ پر خوف طاری ہوا تھا۔ اس کے بعد کبھی نہیں ہوا۔ لیکن اپنے اس خوف کا خیال کر کے مجھ پر ہمیشہ شرم طاری ہو جاتی ہے۔"

اس کے بعد حاجی مراد نے گھڑی نکالی اور بولا۔

اے ڈی سی نے کہا۔

"بہتر ہے تم نماز ادا کرو۔ میں یہاں انتظار کرتا ہوں۔"

چنانچہ حاجی مراد نماز کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

جب حاجی مراد نماز ادا کرنے کے لئے اپنی قیام گاہ میں آگیا تو اے ڈی سی نے اس وقفہ سے فائدہ اٹھا کر اس کی تمام حکایت قلم بند کرنی شروع کی۔ بہت دیر تک بیٹھا ہوا لکھتا رہا۔

آخری تھوڑی دیر بعد اٹھ کر ٹہلتا ٹہلتا حاجی مراد کی قیام گاہ تک چلا گیا۔

وہاں اس نے زور زور سے تاتاری میں بات کرتے آواز سنی۔

اندر آیا تو وہاں اسے حاجی مراد تو نظر نہیں آیا (وہ دوسرے کمرے میں مصروف نماز تھا) مگر اس کے تینوں ساتھیوں کو آپس میں بحث و مباحثہ کرتا ہوا دیکھا۔

فرش پر اس نے حاجی مراد کے یک چشم مرید غزالی کو بیٹھا ہوا دیکھا جو خاں محمد سے غصہ میں کچھ کہہ رہا تھا۔

مگر اے ڈی سی کو دیکھ کر خاموش ہو گیا' اور چمڑے کی زین کو صاف کرنے لگا۔

غزالی کے پاس زندہ دل و خوش رو خان محمد بیٹھا تھا اور غزالی سے بحث کر رہا تھا۔

وہیں جانثار و قوی الدر قریب میں رکابوں کی صفائی میں مصروف تھا باورچی وہاں موجود نہ تھا۔ شاید کھانا پکا رہا ہو گا۔

اے ڈی سی نے مسکرا کر پوچھا۔

"کس بات پر آپس میں الجھ رہے ہو تم لوگ؟"

خاں محمد نے اے ڈی سی کو جواب دیا۔

"غزالی برابر شیمل کی تعریف کئے جا رہا ہے۔ یہ کہتا ہے کہ شیمل بہت بڑا آدمی ہے۔ عالم ہے اور متقی بھی۔"

اے ڈی سی نے کہا۔

"لیکن یہ کیا بات ہے کہ یہ شخص اس سے موہنہ موڑ کر بھی چلا آیا اور اس کی تعریف بھی کرتا ہے۔"

خان محمد نے مسکرا کر کہا۔

"یہی تو لطف ہے کہ اس کے پاس سے بھاگ آیا اور پھر بھی اس کی تعریف کے گیت گاتا ہے۔"

اے ڈی سی نے پوچھا۔

"کیا غزالی اسے واقعی متقی بھی سمجھتا ہے؟"
یک چشم غزالی نے چمڑا رگڑتے رگڑتے جواب دیا۔
"اگر وہ متقی نہ ہوتا تو لوگ اس کے گرد جمع نہ ہوتے۔"
خان محمد نے کہا۔
"شیمل تو کیا متقی ہو گا۔ ہاں البتہ منصور تھا۔"
پھر بولا۔
"منصور جب امام تھا اور کبھی بستی میں آتا تو لوگ اس کی رکاب کو بوسہ دیتے اور گناہوں سے اجتناب کرنے کا وعدہ کرتے۔ چنانچہ تمام آدمی نیک و پاک زندگی گزارتے تھے۔ نہ تمباکو پیتے نہ شراب۔ اس کے برعکس نماز' روزہ حق ہمسائیگی ادا کرتے تھے۔"
اگر کسی کو کسی دوسرے کا کھویا پیسہ بھی مل جاتا تھا تو وہ اسے سڑک کے کنارے پر ڈال آتا۔ یہ اسی کی برکت تھی کہ لوگوں کو اپنے ہر کام میں کامیابی حاصل ہوا کرتی تھی۔
غزالی نے مونہہ بنا کر کہا۔
"اب بھی اپنے کوہستانی علاقے میں کون تمباکو یا شراب پیتا ہے۔"
خان محمد نے کہا۔
"مگر تیرا شیمل پہاڑی انسان نہیں ہے بلکہ کوہستانی گدھ ہے۔"
غزالی بولا۔
"گدھ نہیں ہے' عقاب ہے۔"
خان محمد نے قصہ ختم کرتے ہوئے کہا۔
"چل عقاب سہی۔"
اے ڈی سی نے جیب سے سگریٹ کیس نکالا۔ سگریٹ دیکھ کر خان محمد کے مونہہ میں پانی بھر آیا۔
اس نے اے ڈی سی سے کہا۔
"ایک سگریٹ مجھے بھی دیجئے۔"
اے ڈی سی نے کہا۔
"لیکن تم لوگوں میں تو تمباکو نوشی منع ہے۔"
خان محمد نے مسکرا کر آنکھ ماری۔
خان محمد نے حاجی مراد کی غیر حاضری کے متعلق کہا۔

"ہاں آقا کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔"

غزالی نے کہا۔

"یہ منافقت ہے۔"

اور اٹھ کر باہر چلا گیا۔

خان محمد سگریٹ پینے لگا۔

خان محمد نے اے ڈی سی سے دریافت کیا۔

"اچھا یہ بتایئے کہ ریشمی لنگی اور سفید ٹوپی کہاں سے خریدی جا سکتی ہے۔"

اے ڈی نے اس سے پوچھا۔

"کیا تمہارے پاس اتنے پیسے ہیں؟"

"بہت کافی۔"

خوش رو الدر نے اے ڈی سی سے کہا۔

"ذرا اس سے پوچھئے تو کہ یہ پیسے اس کے پاس کہاں سے آئے؟"

خان محمد نے کہا۔

"بازی میں جیتے تھے۔"

چند روز ہوئے میں طفلس کے بازار میں جا رہا تھا کہ چند روسی اور امریکن جوا کھیل رہے تھے۔ میں بھی جا کھڑا ہوا۔ میں نے بھی بازی لگائی اور سب جیت لایا۔"

اے ڈی سی نے کہا۔

"اگر ہار جاتا تو؟"

خان محمد نے جواب دیا۔

میری جیب میں پستول موجود تھا۔ اگر مجھے کوئی پکڑنے کی کوشش کرتا تو اسے گولی سے اڑا دیتا۔"

اے ڈی سی نے خان محمد کی باتوں سے اندازہ لگا لیا کہ وہ کس قسم کا انسان تھا بے فکرا' لاپرواہ اور من موجی۔ یہاں بھی وہ قسمت آزمائی کی غرض سے روسی سرحد میں آیا تھا۔

اور ایسا شخص مقدر آزمائی کی غرض سے شمل کے پاس بھی جا سکتا ہے۔
اس کے برعکس الدر اپنے آقا کا وفادار تھا۔ متحمل مزاج اور چٹان کی طرح مضبوط۔
اے ڈی سی صرف یک چشم غزالی کی طبیعت کو پڑھنے میں قاصر رہ گیا۔

اتنا اندازہ اس نے ضرور لگا لیا تھا کہ غزالی شمل کا طرف دار ہے اور روسیوں سے سخت متنفر۔

اے ڈی سی سوچ رہا تھا۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر وہ یہاں کیوں آیا ہے۔

اے ڈی سی کو خیال آیا کہ روسی بڑے افسر حاجی مراد کی سپردگی کو شک و شبہہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

چنانچہ یہ عین ممکن ہے کہ شمل کے باب میں اس کی نفرت و جذبہ انتقام بھی محض ایک افسانہ رہی ہو۔

معلوم ہوتا ہے کہ حاجی مراد نے خود کو روسیوں کے حوالے اس لئے کیا ہے کہ یہاں جاسوسی کرے، پھر موقع ہاتھ آنے پر نکل بھاگے۔

اس کے بعد اپنے کوہستانی علاقہ میں پہنچ کر کسی روز اپنی فوج سے ہم پر چڑھائی کر دے۔

غزالی کا تمام کردار انہی شبہات کی غمازی کرتا تھا۔

اے ڈی سی کا شبہ بڑھتا جا رہا تھا۔

غزالی کے علاوہ حاجی مراد کے دوسرے رفقاء اور خود حاجی مراد اپنے مخالفانہ عزائم کو پوشیدہ رکھنے کا سلیقہ جانتے تھے۔

صرف سطحی طبیعت والے غزالی کا کردار ہی اپنے تمام ساتھیوں کی نیت کو بے نقاب کرتا ہے۔

اے ڈی سی انہی شبہات میں کھڑا تھا۔

حاجی مراد کا چوتھا مرید حنیف باہر نکلا۔ اس کے جسم پر گھنے بال تھے اس کے تولے بھی بڑے مضبوط تھے، اور وہ بڑا جفاکش تھا۔

ہر وقت کام میں لگا رہتا تھا اور الدر کی طرح وہ بھی اپنے آقا کا بے حد وفادار تھا۔

جب وہ کمرے میں داخل ہوا تو اس کے ہاتھ میں تھوڑے سے چاول تھے اے ڈی سی نے باتوں کے لئے اسے روکتے ہوئے پوچھا۔

"تمہارا وطن کہاں ہے اور حاجی مراد کے پاس کب سے ہو؟"

حنیف نے جواب دیا۔

پانچ سال سے اور میں اپنے آقا ہی کا ہم وطن ہوں۔

پھر بولا۔

"میرے بھائی نے حاجی مراد کے چچا کو مار ڈالا تھا۔ چنانچہ وہ انتقاماً میری جان لینا چاہتے تھے۔ اس پر میں نے ان سے درخواست کی کہ مجھے اپنے بھائی کی جگہ متنبہ کر لو۔

اے ڈی نے دریافت کیا۔

"بھائی کی طرح متنبہ کرنے سے کیا مطلب؟"

اس نے جواب دیا۔

"دو ماہ تک میں نے نہ تو اپنے ناخن تراشے اور نہ بال۔"

اے ڈی سی نے پوچھا۔

"میں سمجھا نہیں اس کا مطلب۔"

حنیف نے کہا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے حاجی مراد کی والدہ کے سینے سے مونہہ لگا لیا' اس طرح اس کا بھائی بن گیا۔

اس اثنا میں حاجی مراد نے حنیف کو آواز دی۔

وہ جلدی سے ہاتھ دھو کر اس کے پاس بھاگا ہوا پہنچا۔

پھر چند منٹ بعد واپس آکر اے ڈی سی سے بولا۔

"چلئے آپ کو آقا یاد کر رہے ہیں۔"

اے ڈی سی نے زندہ دل خان محمد کو دوسرا سگریٹ دیا اور حنیف کے ساتھ حاجی مراد کے پاس پہنچا۔

اے ڈی سی اندر آیا تو حاجی مراد نے خندہ پیشانی سے اس کا خیر مقدم کیا وہ مصلیٰ تہہ کر کے تخت پر بیٹھا ہوا تھا۔ اے ڈی سی کو کرسی پیش کی۔

حاجی مراد نے اے ڈی سی سے کہا۔

"کہئے میں اپنی ادھوری روداد حیات کو آگے بڑھاؤں؟"

اے ڈی سی نے کہا۔

"ہاں ضرور۔ میں اس دوران میں آپ کے رفقاء سے باتیں کرتا رہا۔ ان میں سے ایک بڑا زندہ دل ہے۔"

حاجی مراد بولا۔

"آپ کی مراد خان محمد سے ہو گی۔ ہاں وہ لاابالی سا انسان ہے۔"

اے ڈی سی بولا۔

"مجھے وہ خوش رو نوجوان بھی بہت پسند آیا۔"

حاجی مراد نے کہا۔

"ہاں الدر۔ بڑا مضبوط و راسخ الاعتقاد شخص ہے۔"

پھر ذرا وقفہ ہو گیا۔

حاجی مراد نے کہا۔

"اچھا تو میں اپنی حکایت شروع کرتا ہوں۔"

اے ڈی سی نے کہا۔

"ہاں آگے چلئے۔"

حاجی مراد نے کہا۔

"کہاں سے چھوڑا تھا میں نے؟"

اچھا یاد آگیا۔ ہاں تو میں بیان کر ہی چکا ہوں کہ خان کے نوجوان لڑکے کس طرح قتل کر دئے گئے تھے۔

لڑکوں کو قتل کرنے کے بعد ہمزاد اپنے آدمیوں کو لے کر خان کے محل میں پہنچا اور محل پر قبضہ کر لیا۔ وہاں بھی چند آدمی مارے گئے صرف خانشہ بچ سکی۔

ہمزاد نے خانشہ کو بلایا وہ آئی اور آتے ہی اس نے ہمزاد کو کوسنا شروع کیا۔

ہمزاد نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا اور خانشہ بھی اسی وقت ختم کر دی گئی۔

اے ڈی سی نے دریافت کیا۔

"ہمزاد نے خانشہ کو کیوں مار ڈالا؟"

"وہ یہی کر سکتا تھا۔ جب اگلی ٹانگیں کٹ جائیں تو پچھلی ٹانگیں کس طرح بچ سکتی ہیں۔"

ہمزاد نے خان کی تمام فیملی کا خاتمہ کر دیا۔

چھوٹا لڑکا بچ گیا تھا' اسے شمل نے پہاڑ پر سے گرا کر مار ڈالا۔

اے ڈی سی نے پوچھا۔

"پھر کیا ہوا؟"

حاجی مراد ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔

"اس کے بعد عواریہ قصبہ فتح کر لیا گیا اور ہمزاد کا اس پر قبضہ ہو گیا لیکن میں اور میرا بھائی ہمزاد کے آگے سپر انداز نہ ہوئے ہم اس سے قصاص لینا چاہتے تھے۔"

خون کے بدلہ خون کیونکہ اس نے خان کی فیملی کا خون بہایا تھا۔

بہرحال ہم نے ہتھیار ڈال دینے کا بہانہ کیا اور رات دن اس فکر میں رہے کہ کس طرح ہمزاد کو قتل کیا جائے۔

آخر ہم نے اپنے دادا سے مشورہ کیا اور یہ طے پایا کہ جب ہمزاد محل سے نکلے تو اس کا خاتمہ کر دیا جائے۔

مگر کسی طرح ہمزاد کو اس کی خبر لگ گئی۔ اس نے میرے دادا کو بلا بھیجا ہمزاد نے میرے دادا سے کہا۔

"تم اور تمہارے پوتے میرے خلاف سازش میں لگے ہوئے ہو۔ یاد رکھو میں تم لوگوں کو ایسی عبرت ناک سزا دوں گا کہ زمین و آسمان کانپ اٹھیں گے دفع ہو یہاں سے۔"

دادا ابا لوٹ آئے۔

ہم دونوں بھائیوں سے بولے۔

"ہمزاد ہمارے درپے آزار ہے۔ خیر ذرا صبر سے کام لو۔"

وہ ذرا رکا اور پھر بولا۔

"چنانچہ ہم نے صبر سے کام لینے کے بجائے ہمزاد کو جلدی ہی ٹھکانے لگانے کا فیصلہ

کیا۔

جمعہ کو ہمزاد مسجد میں نماز پڑھنے آنے والا تھا۔ ہم نے اپنے کسی ساتھی کو اپنے پروگرام میں شریک نہیں کیا۔

بس میں نے اور میرے بھائی عثمان ہی نے ہمزاد کے قتل کا بیڑا اٹھایا۔

ہم دونوں بھائیوں نے پستول سنبھالے اور چادر اوڑھ کر مسجد کا راستہ لیا۔

تھوڑی دیر بعد ہمزاد تیس آدمیوں کو لے کر مسجد میں داخل ہوا۔ اس کے یہ تمام ساتھی برہنہ تلواریں لئے ہوئے آئے تھے۔

اصلدار جو ہمزاد کا دست راست تھا (اسی نے خانشہ کا سر قلم کیا تھا) آگے آگے تھا۔

اس کی ہم پر نظر پڑ گئی چنانچہ ڈانٹ کر بولا۔

"اچھا تم ہو۔ چادریں اتار کر ادھر آؤ۔" اتنا کہہ کر وہ میری طرف بڑھا۔

میں نے پیش قبض نکال لیا۔

اور بڑھ کر اس کا خاتمہ کر دیا اس کے بعد میں ہمزاد کی طرف لپکا لیکن مجھ سے پہلے میرے بھائی نے اس پر گولی چلا دی۔ وہ گرا مگر مرا نہ تھا۔

چنانچہ ہمزاد نے اٹھ کر میرے بھائی پر حملہ کیا۔ اس بار میں نے گولی سے ہمزاد کو آخر ٹھنڈا کر ہی دیا۔

ہمزاد کے تیس آدمی تھے اور ہم فقط دو۔

انہوں نے میرے بھائی عثمان کا خاتمہ کر دیا۔ قریب تھا کہ مجھے بھی گھیر لیتے مگر میں لپک کر کھڑکی سے نیچے کود پڑا اور بچ نکلا۔

جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ ہمزاد مار ڈالا گیا۔

تو وہ اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے ہمزاد کے ساتھیوں کو گھیر لیا۔

ان میں سے بہت سے مارے گئے باقی اس کے رفقا بھاگ چھوٹے۔

پھر اس نے کہنا شروع کیا۔

بظاہر اس فتنے کے خاتمہ کی خوشی تھی مگر جلد ہی پھر معاملات بگڑ گئے۔

مقتول ہمزاد کا جانشین شمل مقرر ہوا۔ دو تین روز بعد ہی اس نے میرے پاس پیغام بھیجا کہ اس کے ساتھ مل کر روسیوں پر حملہ کرنے کو آمادہ ہوں۔ اور اگر میں نے انکار کیا تو وہ میرے گھر کو تباہ کر دے گا اور مجھے بھی مار ڈالے گا۔

اس کے جواب میں میں نے شمل کو کہلا بھیجا۔

"کہ میں کسی قیمت پر اس کا شریک کار نہیں ہو سکتا اور نہ اس کے پاس آنے کو تیار ہوں۔"

اے ڈی سی نے دریافت کیا۔

"تم اس کے پاس گئے کیوں نہیں؟"

حاجی مراد کے ابرو پر بل پڑ گئے۔ اس نے ذرا توقف کیا' پھر بولا

"میں اس سے کس طرح مل سکتا تھا۔

اس کے ہاتھ میرے بھائی عثمان اور ابو نطل کے خون سے رنگے ہوئے تھے۔

اسی زمانے میں جنرل روزین نے میرے پاس کمیشن بھیجا اور مجھے حکم دیا کہ عواریہ کا نظم و نسق سنبھالوں۔ میں ابھی فیصلہ بھی نہ کر پایا تھا۔

کہ جنرل روزین نے پہلے محمد مرزا کو اور بعد میں عقمت خان کو حاکم عواریہ بنا دیا۔

عقمت خان کو مجھ سے دیرینہ دشمنی تھی۔

کیونکہ وہ خانشہ کی لڑکی سلطانہ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ خانشہ نے اس کی درخواست مسترد کر دی۔ اس سے عقمت خان کو یہ مغالطہ ہوا کہ اس میں میرا ہی ہاتھ تھا۔

عقمت خاں کو مجھ سے اتنی دشمنی ہو گئی تھی۔

کہ اس نے میرے قتل پر اپنے آدمی لگا دئے تھے' لیکن میں بچ نکلا۔

اس کے بعد اس نے جنرل لوجینو سے میری چغلی کھائی اور یہ کہا کہ میں نے عواریہ والوں کو منع کر دیا کہ روسیوں کو ایندھن سپلائی نہ کریں۔

اور یہ بھی کہا کہ میں نے شمل سے بیعت کر لی ہے۔

جنرل لویجنو نے اس کی بات کا یقین نہیں کیا۔

اس نے عقمت خان کو ہدایت کر دی کہ مجھ سے کوئی تعرض نہ کرے لیکن جوں ہی جنرل طفلس روانہ ہوا' عقمت خان مجھے ستانے کو آزاد ہو گیا۔

اس نے میری گرفتاری کے لئے ایک دستہ بھیجا تاکہ مجھے پابجولاں کر کے توپ کے مونہہ سے باندھ دیا جائے۔

چھ سات روز تک عقمت خان نے مجھے حراست میں رکھا۔

آٹھویں دن میری بندشیں کھول دی گئیں اور تیمور خان شورا کے پاس لے گئے۔

چالیس ہتھیار بند سپاہی مجھے گھیرے ہوئے تھے۔ میرے ہاتھ باندھ دئے گئے تھے اور مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ عقمت خان نے سپاہیوں سے کہہ دیا ہے کہ میرے گولی مار دی

جائے۔

جب ہم منسوط کے قریب پہنچے۔

ایک تنگ درہ شروع ہو گیا۔ میرے بائیں طرف سو فیٹ گہرا ایک غار تھا۔ میں غار کے دہانے کی طرف لپکا۔ ایک سپاہی نے مجھے روکنا چاہا۔ لیکن میں غار میں کود گیا اور سپاہی کو بھی اپنے ساتھ لے مرا۔

سپاہی تو گرتے ہی مر گیا۔ میں بچ گیا۔ میری ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی بس اسی وقت سے میں لنگڑا ہوں۔

میری صرف ٹانگ ہی نہیں ٹوٹی تھی بلکہ پسلیاں اور بازو وغیرہ کی ہڈی بھی ٹوٹ گئی تھی۔

پھر بھی میں نے رینگنا چاہا لیکن فرط تکلیف و صدمہ سے بیہوش ہو گیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو خون میں تر بتر تھا۔

ایک گڈریے نے مجھے دیکھا اس نے مدد کے لئے چند آدمی بلا لئے جو مجھے اٹھا کر ایک گاؤں میں لے گئے۔

کچھ عرصہ بعد میری پسلیاں اور بازو کی ہڈی جڑ گئی۔ ٹانگ بھی درست ہو گئی لیکن لنگ باقی رہ گیا۔

یہ کہہ کر حاجی مراد نے اپنی لنگڑی ٹانگ پھیلائی۔

لوگوں کو میرا حال معلوم ہوا تو میرے پاس آنے لگے۔

بہرحال میں پھر چاق و چوبند ہو گیا اور سالمیز کی طرف روانہ ہوا۔

چنانچہ عواریہ والوں نے پھر مجھ سے حکمرانی کی درخواست کی میں آمادہ ہو گیا۔

اتنا کہہ کر حاجی مراد رکا۔

پھر اٹھ کر چمڑے کی زین کے پاس پہنچا اور اس کے اندر سے دو بوسیدہ سے خط نکال لایا۔

اس کے بعد ان میں سے ایک خط اس نے اے ڈی سی کے ہاتھ میں دیا۔ یہ خطوط جنرل لوجینو کے تھے۔

اے ڈی سی نے ایک خط مندرجہ ذیل عبارت پر مشتمل تھا پڑھنا شروع کیا:

"لیفٹیننٹ حاجی مراد۔"

تم میری ماتحتی میں کام کر چکے ہو۔ میں تمہاری کارکردگی سے مطمئن تھا اور تمہیں اچھا

آدمی سمجھتا تھا۔

مگر چند روز ہوئے عقمت خان نے مجھے لکھا کہ تم غدار ہو۔ اس کا کہنا ہے کہ تم نے شمل سے بیعت کر لی ہے۔

اس کے علاوہ تم لوگوں کو روسی حکومت کے خلاف بھڑکا رہے ہو۔ چنانچہ میں نے تمہاری گرفتاری کا حکم صادر کر دیا تھا مگر تم روپوش ہو گئے۔

میں کہہ نہیں سکتا کہ عقمت خان کے لگائے ہوئے الزامات کے بارے میں تمہاری صحیح پوزیشن کیا ہے اور آیا تم فی الحقیقت ملزم ہو یا نہیں۔

خیر میں تمہیں موقع دیتا ہوں۔

اگر تمہارا ضمیر صاف ہے اور اگر تم خود کو زار اعظم کا باغی نہیں سمجھتے ہو تو میرے پاس چلے آؤ' اور کسی سے نہ ڈرو۔

میں تمہارا محافظ ہوں۔ عقمت خان تمہارا بال بیکا نہیں کر سکتا' وہ بھی تو آخر میرا ہی ماتحت ہے۔

لہٰذا تم دل میں کوئی خطرہ نہ لاؤ۔

اسی خط کو اے ڈی سی آگے پڑھنے لگا۔
تحریر تھا:
"تمہیں معلوم ہی ہے لیفٹیننٹ مراد کہ میں اپنے قول کا پکا اور وعدہ کا سچا ہوں' اس لئے تم فوراً میرے پاس چلے آؤ۔"
جب اے ڈی سی یہ خط ختم کر چکا۔
حاجی مراد نے اسے دوسرا خط دکھایا' یہ حاجی مراد کا جواب تھا:
"جنرل صاحب"
یہ غلط ہے کہ میں نے شیمل سے بیعت کر لی ہے۔ میں اس سے کس طرح بیعت کر سکتا ہوں۔ اس کی گردن پر تو میرے والد' بھائی اور رشتہ داروں کا خون ہے۔
لیکن میں روسیوں کا بھی حامی نہیں ہو سکتا کیونکہ انہوں نے میری بے عزتی کی تھی۔ جب وہ مجھے پابجولاں لے جا رہے تھے تو ایک روسی سپاہی نے میرے اوپر تھوکا تھا۔
میں آپ لوگوں سے اس وقت تک نہیں مل سکتا جب تک مجھ پر تھوکنے والا قتل نہ کر دیا جائے۔ اس کے علاوہ مجھے کاذب عقمت خان سے بھی نبٹنا ہے۔"
"میرے اس خط کے جواب میں جنرل لوجینو نے یہ خط لکھا۔"
یہ کہہ کر حاجی مراد نے ایک خط اور اے ڈی سی کو دیا۔
اس کی یہ عبارت تھی۔
تمہارا جواب ملا۔
تم نے لکھا ہے کہ جس شخص نے تمہاری توہین کی تھی اسے جب تک سزا نہیں ملے گی تم نہیں آؤ گے۔
میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ ہمارے قانون میں انصاف ہے چنانچہ تم اپنی آنکھوں سے اس شخص کو سزا پاتا ہو دیکھ لو گے۔
میں نے پہلے ہی تحقیقات کا حکم دے دیا ہے۔
سنو حاجی مراد۔
مجھے تم سے ناراض ہونے کا حق ہے کیونکہ تم میرا اعتبار نہیں کر رہے ہو۔

میں تمہیں معاف کرتا ہوں' میں جانتا ہوں کہ تم کوہستانی لوگ بڑی شکی طبیعت کے ہوتے ہو۔

اگر تمہارا ضمیر پاک ہے اور تم نے شمل سے بیعت نہیں کی ہے تو روسی حکومت سے چار آنکھیں کرنے میں کیوں جھجکتے ہو۔

میں پھر تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ جو تمہاری بے عزتی کرے گا اسے سزا ملے گی۔

میں تمہاری جاگیرو جائداد بھی بحال کر دوں گا۔ تمہیں خود معلوم ہو جائے گا کہ روسی قانون کیسا ہے۔

اس کے علاوہ ہم روسی لوگ واقعات کو دوسرے انداز میں دیکھتے ہیں۔

اگر کسی نے تمہاری اہانت کی ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ تم ہماری نگاہ میں بھی پست ہو گئے۔

لہٰذا تم حامل رقعہ کے ساتھ ہی چلے آؤ۔ یہ میرے اعتماد کا آدمی ہے اور تمہارے دشمنوں سے ملا ہوا نہیں ہے۔

"تمہیں بے تکلف چلا آنا چاہئے۔"

خط ختم کرنے کے بعد اے ڈی سی نے اسے حاجی مراد کے حوالے کیا۔

میں جنرل لوجینو کے اس قدر اصرار کے باوجود اس کے پاس نہیں گیا کیوں کہ مجھے اس کا اعتبار نہیں۔

میں نے مناسب یہی سمجھا کہ روسیوں کی مدد لئے بغیر خود ہی اپنے طور پر عقمت خان سے انتقام لوں۔

عقمت خان نے پیش بندی کے طور پر سالیمز کا محاصرہ کر لیا اور مجھے مار ڈالنا چاہا۔

میرے ساتھ بہت ہی کم آدمی تھے۔ اس لئے اسے بھگانے سے قاصر تھا۔

اسی اثناء میں میرے پاس شمل کا ایک خط آیا جس میں عقمت خان کے خلاف میری امداد کا وعدہ کیا تھا اور لکھا تھا۔

کہ وہ آکر عقمت خاں کو قتل کر دے گا۔ اس کے بعد عواریہ کی حکومت میرے سپرد کر دے گا۔

میں اس مسئلہ پر کئی روز تک غور کرتا رہا۔

آخر شمل سے جا ملا بس اس وقت سے میں روسیوں کے خلاف جنگ آزمائی کرنے میں مصروف ہو گیا۔

حاجی مراد نے ذرا توقف کیا۔

اس کے بعد اس نے اپنے تمام فوجی کارنامے سنائے جن کی کافی تعداد تھی اور جن میں بہت سے اے ڈی سی کے علم میں بھی تھے۔

اپنی ان جنگ آزمائیوں میں حاجی مراد اپنی خداداد دلیری و تدبر سے کامیاب ہوا تھا۔

حاجی مراد نے اپنے جنگی کارنامے سنانے کے بعد کہنا شروع کیا۔

"لیکن میرے اور شیمل کے درمیان کبھی دوستانہ تعلقات قائم نہ ہو سکے۔"

"شیمل مجھ سے ڈرتا تھا اور میری دلیرانہ امداد کا محتاج رہتا تھا۔"

چند روز کے بعد لوگوں کے سامنے یہ مسئلہ آیا کہ شیمل کے بعد کسے امام منتخب کیا جائے۔

امام بننے کا سب سے زیادہ وہ شخص مستحق ہے جس کی تلوار سب تلواروں سے زیادہ تیز ہو۔

میں نے لوگوں سے کہا۔

میرے یہ الفاظ شیمل کے علم میں بھی لائے گئے۔

اس سے اس کا خوف اور بڑھ گیا' اور وہ مجھ سے چھٹکارا پانے کی تدبیریں کرنے لگا۔

چنانچہ اس نے مجھے بسران کی تسخیر کا حکم دیا۔

میں نے نہ صرف بسران ہی کو فتح کر لیا بلکہ وہاں سے بھیڑیں اور گھوڑے بھی پکڑ لایا۔

مگر شیمل میرے اس کارنامے سے مطمئن نہ ہوا۔

وہ کہنے لگا۔

ایک نائب کو اس سے بھی بڑا کام کرنا لازم تھا۔

چنانچہ اس نے نیابت سے مجھے مستعفی کر دیا اور لکھا کہ تمہارے پاس جس قدر روپے ہوں واپس بھیج دو۔

میں نے ایک ہزار سونے کے سکے روانہ کر دئے۔

اس پر بھی شیمل نے اکتفا نہیں کی۔

بلکہ اپنے آدمیوں کو بھیج کر میری تمام جاگیر و جائداد پر قبضہ کر لیا ساتھ ہی اس نے مجھے لکھا کہ فوراً اس کے پاس چلا آؤں لیکن میں نہیں گیا۔ جانتا تھا کہ وہ میرے قتل کے درپے ہے۔ آخر مجھے گرفتار کرنے کے لئے اس نے اور آدمی روانہ کئے۔

میں نے مقابلہ کیا اور بچ نکلا پھر پرنس درنوخ کے پاس چلا آیا۔

میں نے اپنی فیملی کو ساتھ نہیں لیا تھا۔ چنانچہ شیمل نے میری والدہ میری بیویوں اور
لڑکے کو گرفتار کر لیا اور اب وہ اس کے چنگل میں ہیں۔
حاجی مراد ذرا رکا پھر بولا۔
تم پرنس ورنوخ سے کہنا۔
جب تک میرے اہل و عیال اور والدہ شیمل کے چنگل میں ہیں میں کچھ نہیں کر سکتا۔
اے ڈی سی نے کہا۔
"اطمینان رکھو میں تمہارا پیام پرنس تک پہنچا دوں گا۔"
حاجی مراد نے اپنی حکایت ختم کرتے ہوئے کہا۔
"ضرور کہنا اور مہربانی کر کے تاکید کے ساتھ پرنس کو بتانا کہ اپنے اہل و عیال کی وجہ
سے میرے ہاتھ پیر بندھے ہوئے ہیں اور رسی کا سرا شیمل کے ہاتھ میں ہے۔"
شیمل کے خلاف جلد میری مدد کی جائے۔ میں اپنی ماں' لڑکے اور بیویوں کی وجہ سے
شب و روز پریشان و ہراساں رہتا ہوں۔
نہ جانے کب شیمل انہیں تہہ تیغ کر دے۔

بیس دسمبر کو پرنس درنوخ نے شرنیشوف کو ایک خط لکھا۔
شرنیشوف زار روس کا وزیر دفاع تھا۔
خط کی عبارت یہ تھی۔
"میں آپ کو جلد خط نہ لکھ سکا کیونکہ ہمیں خود غور کرنا تھا کہ حاجی مراد کے متعلق کیا فیصلہ کریں۔
میں اپنے اگلے خط میں لکھ ہی چکا ہوں کہ "حاجی مراد ہمارے پاس آیا ہوا ہے اور اس نے خود کو ہمارے سپرد کر دیا ہے۔"
وہ آٹھ دسمبر سے یہاں طفلس میں مقیم ہے اور مجھ سے مل چکا ہے۔
اس وقت سے میں سوچ رہا ہوں کہ حاجی مراد کا کیا مصرف کیا جائے۔ بالخصوص سردست ہم اس کے متعلق کیا طے کریں۔
یہ واقعہ ہے کہ وہ اپنی فیملی کے لئے بے حد پریشان ہے اور صاف طور پر کہہ چکا ہے کہ جب تک اس کے اہل و عیال شمل کے قبضے میں ہیں وہ بالکل مفلوج اور بے دست و پا ہے۔
اور یہ کہ وہ موجودہ حالات میں ہمارے کچھ کام نہیں آ سکتا۔ نہ ہماری عنایات و مہمان نوازی کا کوئی صلہ ادا کر سکتا ہے۔
اپنے عزیز و اقارب کی موت و زندگی کے اس سوال کی وجہ سے وہ رات دن سخت بے چینی میں مبتلا رہتا ہے۔
جن لوگوں کو میں نے اس کے پاس مقرر کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ پریشانی کے عالم میں راتوں کو نہیں سوتا۔
نہ کچھ کھاتا ہے' نہ پیتا ہے بس ہر دم دعا میں مصروف رہا کرتا ہے۔
اپنی بیوی بچوں کو شمل کے چنگل میں پھنسے رہنے کے غم میں اس نے اپنی بری حالت بنا لی ہے۔
بارہا میرے آدمیوں سے کہتا رہتا ہے۔
کہ مجھے اب زندگی میں کوئی لذت نہیں۔ میرے ساتھ بس تھوڑے سے آدمی بھیج دو

تاکہ میں واپس چلا جاؤں۔
ہر روز میرے پاس یہ معلوم کرنے آتا ہے کہ آیا مجھے اس کی فیملی کی کچھ خیر و خبر معلوم ہوئی۔
مجھ سے یہ بھی درخواست کرتا ہے کہ ہمارے پاس جتنے تاتاری قیدی ہیں ان کا تبادلہ شمل کے قبضہ میں جو اس کی فیملی ہے اس سے کر لیا جائے۔
تاوان کے طور پر وہ شمل کے پاس کچھ روپے بھی بھیجنے کو تیار ہے۔
بارہا مجھ سے عاجزانہ درخواست کرتا رہتا ہے کہ میرے اہل و عیال کو بچالو میں تمام عمر تمہاری خدمت بڑی وفاداری و بہادری سے کرتا رہوں گا۔
اور اگر ایک ماہ کے اندر میں کوئی کار نمایاں نہ کروں تو جو چور کی سزا وہ میری سزا۔
اس کے الفاظ میں صداقت معلوم ہوتی ہے۔
اور یہ حقیقت ہے کہ جب تک اس کی مظلوم فیملی شمل کے پاس قید ہے اس کا دماغ مختل رہے گا۔
وہ ہمارے کچھ کام نہیں آ سکتا اور نہ اس کے رنج و غم کی وجہ سے ہم اسے اپنے اعتماد میں لے سکتے ہیں۔
اپنے اہل و عیال کے غم میں نامعلوم وہ کیا کر بیٹھے۔
میں اسے تسکین دلاتا رہتا ہوں کہ جو کچھ ممکن ہے اس سے دریغ نہیں کیا جائے گا۔
قیدیوں کے تبادلے پر بھی غور کریں گے لیکن قانوناً حکومت کی جانب سے میں اس کی فیملی کے لئے تاوان ادا کرنے سے قاصر ہوں۔ یہ سب کچھ میں اس سے کہتا رہتا ہوں۔
اس کے ساتھ ہی میں نے صفائی سے اس سے یہ کہہ دیا ہے۔
تاوان اور قیدیوں کے تبادلے کے باوجود خطرہ ہے کہ شمل اس کی فیملی کو آزاد نہیں کرے گا' ممکن ہے شمل خود اس سے یہ صاف بات کہہ دے اور یہ بھی وعدہ کر لے کہ وہ حاجی مراد کو معاف کر کے اس کے سابقہ عہدے پر بحال کر دے گا۔
یا ہو سکتا ہے کہ شمل حاجی مراد کو یہ دھمکی بھی دے کہ اگر تو واپس نہ آیا۔
تو تیرے پانچوں بچوں' بیویوں اور ماں کو قتل کر دے گا۔
میں نے حاجی مراد سے دریافت کیا تھا۔
کہ اگر فرض کرو شمل نے یہی کہا تو وہ کیا کرے گا۔ اس کے جواب میں اس نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے اور بولا کہ سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

لیکن وہ اپنے دشمن کے آگے کبھی سپر انداز نہ ہو گا۔
رہا شمل کے ہاتھوں اس کی فیملی کے قتل کا امکان تو حاجی مراد کو ایک موہوم سی یہ امید ہے کہ شمل ایسی تو کیا سنگ دلی کر گزرے گا۔
پھر شمل اسے اپنا اور بھی بدترین دشمن بنانا نہ چاہے گا۔ پہلے ہی داغستان میں شمل کے کافی مخالفین موجود تھے۔
ان سے وہ دشمنی مول لینے سے جھجکتا تھا۔
بہرحال حاجی مراد مجھ سے کہتا ہے۔
کہ جو خدا کو منظور ہے وہ ہو کر رہے گا۔ مگر مجھے کسی چیز سے دل چسپی نہیں بس وہ تو اپنی فیملی کو شمل کے چنگل سے تاوان ادا کر کے رہا کرانے کے لئے بے چین ہے۔
خدا کا واسطہ دے دے کر مجھ سے التجا کرتا ہے کہ اس باب میں اس کی مدد کی جائے۔
اور کہتا ہے کہ اسے شیشنیا کے نوح میں پہنچنے کی اجازت دے دی جائے تاکہ وہاں پہنچ کر روسی افسر کے ذریعے اپنی فیملی کے متعلق کچھ معلوم کر سکے۔
اور اگر موقع لگے تو اپنے اہل و عیال کو رہائی بھی دلا سکے۔
حاجی مراد کا یہ کہنا بھی ہے۔
کہ دشمن کے اس علاقے میں بہت سے لوگ بلکہ نائب لوگ اس کا کلمہ بھرتے ہیں۔
وہ علاقہ ہمارے زیر نگیں ہے۔ اس لئے حاجی مراد کو وہاں اپنی دلی تمنا کی برآری کی توقع ہے۔
اپنی فیملی کے لئے اس کا شب و روز کا اضطراب بھی مٹ جائے گا اور اسے سکون قلبی میسر آ جائے گا۔
اس کے بعد وہ یک سوئی سے ہماری خدمت کر سکے گا۔
وہ مجھ سے درخواست کرتا ہے۔
کہ بیس پچیس روسی سپاہیوں کے ساتھ اسے غروزنی بھیج دیا جائے۔
یہ سپاہی اس کی حفاظت بھی کریں گے اور اس کی نگرانی بھی۔
یعنی اپنی نیک نیتی کی گارنٹی کے ثبوت میں وہ ہمارے سپاہیوں کے ساتھ جانے کو تیار ہے۔
آپ نے خود اندازہ لگا لیا ہو گا کہ میں ان تمام واقعات کے باب میں سخت الجھن میں مبتلا ہوں۔

کیوں کہ حاجی مراد کے لئے جو کچھ بھی کیا جائے گا اس کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہو گی۔

یہ تو میں بھی کہوں گا کہ حاجی مراد پر کلیتہ" اعتماد کر لینا دانائی سے دور ہو گا لیکن اس میں بھی عقل مندی نہیں ہے۔

کہ اس کے فرار ہو جانے کے امکانات کے پیش نظر اسے حراست میں کر لیا جائے۔

یہ انصاف سے بعید ہے۔

اگر ہم نے اسے نظر بند کر دیا تو یہ خبر تمام داغستان میں پھیل جائے گی۔

اس سے وہاں جو لوگ ہمارے طرف دار ہیں وہ علانیہ خلاف ہو کر شمیل سے مل جائیں گے۔

اس وقت داغستان والوں کی ہم پر نگاہیں لگی ہوئی ہیں کہ حاجی مراد جیسے شجاع و جنگ آزما شخص سے ہم کس قسم کا سلوک روا رکھتے ہیں۔

اگر ہم حاجی مراد کو قیدی کی طرح رکھتے ہیں تو داغستان میں ہمارا تمام اثر ختم ہو جائے گا۔

چنانچہ بہتر یہی ہے کہ جیسا مناسب سلوک اس وقت حاجی مراد کے ساتھ کر رہے ہیں' اسے برقرار رکھیں۔

حالانکہ مجھے یہ خدشہ بھی ہے کہ اس طریق کار میں کہیں مجھ پر کوئی الزام نہ آ جائے۔

کیونکہ بعید نہیں کہ حاجی مراد کے دل میں فرار ہو جانے کا خیال جاگزیں ہو۔

اگرچہ اس کا فرار ہونا مشکل ہے لیکن ناممکن نہیں۔

مسٹر شرنیشوف میں آپ سے درخواست کرتا ہوں۔

کہ یہ تمام واقعات شہنشاہ سلامت کی خدمت میں پیش کر دیں تاکہ وہ ان پر غور فرما سکیں۔

اگر بادشاہ سلامت نے میری کارروائیوں پر حکم صادر فرما دیا تو میری مسرت کی انتہا نہ رہے گی۔

جو کچھ میں نے آپ کو لکھا ہے۔ باریں مضمون ایک خط جنرل زوودسکی اور جنرل زلوسکی کو بھی تحریر کیا ہے۔

تاکہ حاجی مراد سے اگر وہ براہ راست مراسلت کریں تو اس کی نقل میرے پاس بھی بھیج دیں۔ ساتھ ہی میں نے حاجی مراد کو ہدایت کر دی ہے کہ جنرل زلوسکی کی اجازت کے

بغیر کہیں نہ جائے۔

میں نے حاجی مراد کو یہ بھی تاکید کر دی ہے کہ اگر کہیں آئے جائے تو ہمارے سپاہی اپنے ساتھ رکھے تاکہ شمل کو یہ افواہ اڑانے کا موقع نہ ملے کہ ہم نے حاجی مراد کو قید میں ڈال دیا ہے۔

اور حاجی مراد سے یہ وعدہ بھی لے لیا ہے کہ وہ دوبارہ میرے لڑکے پرنس سائن درنوخ سے جا کر نہ ملے کیونکہ وہ وہاں کا کمانڈر نہیں ہے۔

میرا لڑکا دشمن کی سرحد کے بالکل قریب مقام پر مامور ہے۔ حاجی مراد نے سب سے پہلے خود کو اسی کے سپرد کیا تھا۔ اس لئے' اس کے لئے غروزنی ہی مناسب مقام ہے۔

حاجی مراد کی اپنی خواہش کے مطابق بیس سپاہیوں کے علاوہ میں کپتان بورس کو بھی اس پر مامور کرتا ہوں۔

کپتان بورس بڑا ذہین اور ہونہار افسر ہے۔

وہ تاتاری زبان بھی جانتا ہے اور حاجی مراد سے بھی واقف ہے۔

حاجی مراد اپنے دس روزہ یہاں کے قیام میں اسی مکان کے اندر فروکش تھا جس کے ایک حصے میں لیفٹیننٹ کرنل رخنوف رہتا تھا۔

رخنوف آج کل ضلع شوشین کی کمانڈ میں ہے۔ قابل آدمی ہے اور بھروسہ کے لائق بھی۔

رخنوف نے حاجی مراد کا بھی اعتماد حاصل کر لیا ہے۔ اور اسی کے ذریعے ہمیں بہت سے بھید معلوم ہوئے ہیں۔

حاجی مراد کے باب میں میں نے رخنوف سے بھی مشورہ کیا تھا۔

وہ بھی میری رائے سے اتفاق کرتا ہے کہ یا تو ہم اپنا موجودہ اچھا سلوک حاجی مراد کے ساتھ برقرار رہنے دیں یا اسے حراست میں لے لیں یا اسے اپنی سرحد سے بالکل نکال دیں۔

رخنوف کو حاجی مراد کی ایک یہی بات ذرا کھٹکی کہ وہ بے حد مذہبی واقع ہوا ہے۔ اس سے اندیشہ کی گنجائش ہے کہ کہیں اسی جذبے کی بنا پر شمل اس پر اثر انداز نہ ہو جائے۔ لیکن حاجی مراد شمل کا طرف دار نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کی فیملی اس کے پاس قید ہے۔

بس جناب نواب شرنیشوف مجھے یہی واقعات گوش گزار کرنے تھے اب اپنا طویل خط ختم کرتا ہوں۔

یہ رپورٹ طفلس سے چوبیس دسمبر ۱۸۵۱ء کو روانہ کی گئی تھی اور کئی سوار طفلس سے طویل مسافت طے کر کے دارالخلافہ پہنچے۔ انہوں نے یہ رپورٹ جا کر شرنیشوف وزیر دفاع کے حوالے کی تھی۔

چنانچہ یکم جنوری ۱۸۵۲ء کو شرنیشوف نے دوسرے کاغذات کے ساتھ اس رپورٹ کا بھی مطالعہ کیا اور بادشاہ کے سامنے اسے پیش کر دیا۔

شرنیشوف شروع ہی سے بوڑھے دولت مند پرنس درنوخ سے جلتا تھا کیونکہ ایک تو درنوخ ہر دل عزیز انسان تھا دوسرے اس کے قبضے میں دولت بے قیاس تھی۔

پھر اس کے حسد کی ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ بادشاہ بھی درنوخ کی قدر کرتا تھا۔

اسی حسد کی بنا پر شرنیشوف ہر موقع پر درنوخ کو زک پہنچانے کی فکر میں رہتا تھا۔

پچھلی دفعہ جب شرنیشوف نے قزاقوں کے بارے میں شاہ نکولس (زار روس) کے سامنے رپورٹ پیش کی تھی تو وہ بادشاہ کے دل میں درنوخ کے خلاف بال ڈالنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

کیونکہ کمانڈروں کی ذرا سی غلطی کی وجہ سے قزاقوں (روسی سرحدی سپاہ) کی پوری رجمنٹ کو تاتاریوں نے تباہ کر دیا تھا۔

چنانچہ اس دفعہ بھی درنوخ نے حاجی مراد کے بارے میں جو قدم اٹھایا تھا' اسے شرنیشوف نے بادشاہ کی نگاہ میں غلط پر خطر ثابت کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔

اس نے بادشاہ کے دل میں یہ بات بٹھا دی کہ درنوخ ہمیشہ تاتاریوں کی طرف داری کر جاتا ہے۔ اس سے روسی وقار کو دھچکا لگتا ہے۔

اور حاجی مراد کو اس نے سرحد میں بلا کر سخت غلطی کی ہے۔ کیونکہ یہ یقین کر لینے کی کئی وجوہات ہیں۔

حاجی مراد صرف جاسوسی کی غرض سے وارد ہوا ہے۔ اس لئے مناسب یہ ہے کہ اسے وسط روس میں بھیج دیا جائے۔

اس کے بعد اس کی فیملی کو شمل کے پاس سے رہائی دلا کر اس سے (حاجی مراد) سے کچھ کام لیا جائے۔

تب ہی اس کی وفاداری کی جانچ ہو سکے گی۔
شرنیشوف کا یہ پلان (پرنس درنوخ کے متعلق بدگوئی اور حاجی مراد کو ذلیل کرنا) کامیاب نہ ہوا۔
کیونکہ سال نو کے موقع شہنشاہ نکولاس کا کسی وجہ سے موڈ بہت خراب ہو رہا تھا۔ اسی سبب سے وہ کسی کی کوئی تجویز سننا گوارا نہ کر رہا تھا۔
خاص طور پر شرنیشوف کی کوئی تجویز کیونکہ نکولاس خود شرنیشوف کو اچھا آدمی نہیں سمجھتا تھا۔
نکولاس اچھی طرح جانتا تھا۔
کہ یہی وہی شرنیشوف تھا جس نے شروع میں اس کی تخت نشینی کی ممانعت کی تھی اور زچاری کی جائداد ہضم کر گیا تھا۔
اس وقت محض وقتی طور پر کام نکالنے کو نکولاس نے شرنیشوف کو وزیر دفاع بنا رکھا تھا۔

ورنہ کچھ عرصہ بعد اس کا کان پکڑ کر نکال دینے کا ارادہ رکھتا تھا۔
بہرحال نکولاس کی بدمزگی اور خراب موڈ اس وقت حاجی مراد کے حق میں مفید ثابت ہوئی۔
اس کے حالات جیسے تھے ویسے ہی رہنے دئے گئے۔ اور اسے وسط روس میں نظربند کرنے کی نوبت نہ آئی۔
اگر نکولاس حسب معمول سال نو کی خوشی میں اچھے موڈ میں ہوتا تو واقعی شرنیشوف کا اس کے خلاف جادو چل جاتا۔
غرض نو بجے جبکہ سردی کی وجہ سے درجہ حرارت پندرہ ڈگری زیر انجماد تھا۔
شرنیشوف بڑی آن بان سے نکولاس کے موسم سرما کے محل میں داخل ہوا۔
اور کافی انتظار کے بعد اسے باریابی حاصل ہوئی۔
محل موسم سرما حال ہی میں تعمیر ہوا تھا مگر شہنشاہ نکولاس اوپر کے حصے میں رہتا تھا۔
کیونکہ اس کا زیریں حصہ آگ لگ جانے سے مکمل طور پر ابھی درست نہ ہوا تھا۔
جس جگہ وہ اپنے منسٹروں سے ملاقات کرتا تھا وہ بہت بڑا کمرہ تھا۔
جس میں چار بہت بڑی بڑی کھڑکیاں تھیں۔ ایک طرف شہنشاہ الگزنڈر کا بڑا سا فوٹو آویزاں تھا۔

کسی ہوئی تھی۔
نکولاس تودۂ لحم تھا۔ اس کی توند لیس سے کسی ہوئی تھی۔
اس نے سیاہ رنگ کا موٹا لبادہ پہن رکھا تھا اور آنے والے ملاقاتیوں کو بغیر کسی خاص تاثر کے دیکھ رہا تھا۔
اس کا چوڑا اور زرد چہرہ سرد و سنگین سا نظر آ رہا تھا۔ اس کی چمک سے خالی آنکھیں آج اور بھی بے نور سی نظر آ رہی تھیں۔
تکان کی وجہ سے اس کا موڈ خراب ہو رہا تھا۔
یہی سبب تھا کہ اسے کسی چیز میں دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔
کچھ فاصلہ پر مخملیں صوفے پر ایک افسر بیٹھا ہوا تھا۔
جس کے [illegible] یک حسین و نوجوان عورت بیٹھی تھی اس کے گھونگر والے بال بہت اچھے نظر آ رہے تھے۔ لیکن شہنشاہ نکولاس کا خراب موڈ اور بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر اس نے نقاب ڈال لیا۔
اسی طرح وہ آفیسر بھی نکولاس کی بدمزگی کی وجہ سے دم بخود بیٹھا ہوا تھا
دوسروں کو مرعوب دیکھ کر نکولاس خوش ہوتا تھا۔
ایسے [illegible]روب لوگوں سے کبھی وہ ملائم الفاظ میں مخاطب ہوتا تھا۔ لیکن یہ اس کی عام عادت نہ تھی۔
نکولاس اس افسر سے مخاطب ہوا۔
"میاں تم تو مجھ سے بھی کم عمر نظر آتے ہو۔"
"کیا اپنی جگہ مجھے دینا چاہتے ہو۔"
افسر اسی وقت فرط رعب و ادب سے اٹھ کھڑا ہوا۔
پہلے اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ پھر سرخ ہو گیا۔ اس کے بعد ادب سے دوہرا ہو گیا۔ اور فوراً باہر نکل گیا۔
نکولاس اب اس خاتون کے ساتھ اکیلا تھا۔
یہ کوئی بیس سالہ دوشیزہ تھی اور سویڈن کے گورنر کی بیٹی تھی۔
حسینہ سے نکولاس نے کہا۔
"میں تو بچپن ہی میں آپ کی فقط تصاویر دیکھ کر ہی آپ پر عاشق ہو گئی تھی۔ اسی زمانے سے میں نے دل میں ٹھان لی تھی کی چاہے کچھ ہی ہو آپ کا التفات جیت کر رہوں گی۔"

چنانچہ اس حسین لڑکی کو ایک فرحت ناک مقام پر پہنچایا گیا جہاں نکولاس نے ایک گھنٹہ سے زیادہ اس کی معیت میں صرف کیا۔

اسی مقام پر نکولاس کے لئے دوسری عورتیں بھی لائی جاتی تھیں۔

جب وہ واپس کمرے میں آیا تو آج کی حسینہ کی ملاقات کے تصور سے دیر تک لطف لیتا رہا۔

وہ اس نازک اندام لڑکی کا مقابلہ دل میں اپنی محبوبہ نیلودیوا کے فربہ بدن سے کر رہا تھا۔

یہ لڑکی کس قدر خائف ہو گئی تھی۔ شادی شدہ ہونے کے باوجود اسے اپنی بدچلنی کا کوئی احساس نہ تھا۔

اور کوئی اسے ایسا احساس دلا دیتا تو وہ نامعلوم کیا کرتا۔

اس لڑکی کے ساتھ خوش وقتی کے تصور سے اسے کوئی پچھتاوا نہ تھا۔

مگر پھر بھی اسے کچھ ایسا معلوم ہونے لگتا تھا جیسے کوئی غلطی سرزد ہو گئی ہو' لیکن اپنی قدرت کا خیال کر کے وہ سب کچھ بھول جاتا تھا۔

آج وہ اگرچہ دیر میں سویا تھا مگر صبح حسب معمول بیدار ہو گیا۔ ضروریات سے فارغ ہوا اور اپنے تمام فربہ جسم کو برف سے رگڑا پھر طوطے کی طرح اپنی عبادت کے الفاظ دہرائے۔ اس کے بعد فوجی لباس پہن کر باہر نکل گیا۔

باہر احاطے کے قریب اس نے ایک طالب علم کو دیکھا۔
یہ طالب علم بھی اتنا ہی موٹا تازہ تھا جتنا نکولاس تھا۔ نکولاس کو اس کا لباس پسند نہیں
آیا۔
مگر موٹے طالب علم نے جس مشقت سے اپنے جسم کو سنبھال کر اسے سلام کیا تھا اس
سے نکولاس نے اسے معاف کر دیا۔
نکولاس نے طالب علم سے دریافت کیا۔
"کیا نام ہے تمہارا؟"
طالب علم نے جواب دیا۔
"پولوساتوف جہاں پناہ۔"
نکولاس بولا
"خوب آدمی ہو۔"
طالب علم ادب سے کھڑا رہا۔
"کیا تم فوج میں بھرتی ہونا چاہتے ہو؟"
طالب علم نے کہا۔
"نہیں حضور والا۔"
نکولاس نے کہا۔
"احمق۔"
اپنی چہل قدمی میں مصروف ہو گیا۔
نکولاس نے آہستہ آہستہ کہا۔
"کوپر وائین ---- کوپر وائین
یہ اسی کل والی حسینہ کا نام تھا جس کے ساتھ اس نے شب کو پر لطف لمحات گزارے
تھے۔
نکولاس نے خود سے بکنا شروع کیا۔
"ڈر گئی ----- ڈر گئی -----"

اسے خود معلوم نہ تھا کہ کیا بک رہا ہے۔
اس نے اپنے آپ سے کہنا شروع کیا۔
"میرے بغیر روس پر کیا گزرے گی۔"
وہ پھر بکنے لگا۔

صرف روس ہی پر نہیں بلکہ تمام یورپ پر میرے بغیر کیا گزرے گی۔ اور اپنے سالے کی (جو جرمنی کا بادشاہ تھا) حماقتوں کا تصور کر کے سرہلانے لگا۔

جب وہ اپنی چہل قدمی سے لوٹ رہا تھا تو اس کی نظر ایک خوب صورت چھوٹی سی گاڑی پر پڑی۔ اس میں ہیلنا بیٹھی ہوئی تھی۔

ہیلنا اس کے مرحوم بھائی مائیکل کی بیوہ تھی۔ بڑی تعلیم یافتہ و مہذب' اسے سائنس' آرٹ اور امور عامہ میں بڑا درک حاصل تھا۔

ہیلنا کی گاڑی کے پیچھے سرخ لباس میں ایک کوچ مین کھڑا ہوا تھا۔

نکولاس کی نظر میں ہیلنا ان حماقت مجسم لوگوں میں سے تھی جو نہ صرف سائنس اور آرٹ میں سر کھپاتے ہیں بلکہ طریق حکمرانی پر بھی بحث کیا کرتے ہیں۔

(یہ نکولاس کی بداخلاقی و جہل کی دلیل تھی) اور خود کو نکولاس کے مقابلے میں بہتر طریقے پر حکمرانی کا اہل سمجھتے ہیں۔

نکولاس کو احساس تھا کہ ایسے افراد کو خواہ بار بار کچلا جائے' مگر وہ بار دیگر سر ابھارے بغیر نہیں رہتے۔

اس ضمن میں اسے اپنا متوفی بھائی مائیکل بھی یاد آیا۔ جس نے حال ہی میں وفات پائی تھی۔

اس تصور سے اس کے ابرو پر غم کے آثار پیدا ہو گئے۔

اور وہ حسب عادت جو پہلا لفظ اس کے مونہہ میں آیا پھر بد بدانے لگا اور اس وقت تک بد بداتا رہا جب تک کہ محل میں داخل نہ ہو گیا۔

اپنے کمرے میں آ کر اس نے مونچھوں کو تاؤ دیا' بالوں کو آراستہ کیا۔
اس کے بعد سیدھا کیبنٹ میں چلا گیا' جہاں وہ باہر سے آئی ہوئی رپورٹیں سنا کرتا تھا۔
سب سے پہلے اس نے شرنیشوف کو طلب کیا۔
شرنیشوف نے اس کے بشرے ہی سے اندازہ لگا لیا کہ آج اس کا موڈ خراب ہے۔
نکولاس نے سرد مہری سے اس کا استقبال کیا اور بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

شرنیشوف نے سب سے پہلے جو رپورٹ اس کے گوش گزار کی وہ کمشنری کے افسروں کے غبن کے متعلق تھی۔

دوسری رپورٹ جرمنی کی سرحد پر فوجی نقل و حرکت سے تعلق رکھتی تھی۔

اس کے بعد سال نو کے موقع پر انعام پانے کے مستحق ان لوگوں کی فہرست پیش کی جن کے نام پہلے حذف کر دیے گئے تھے۔

اس سے فارغ ہو کر شرنیشوف نے حاجی مراد کا ذکر کیا۔

اور سب سے آخر میں کسی میڈیکل طالب علم کے اقدام قتل کا تذکرہ کیا جو ایک پروفیسر کو مار ڈالنا چاہتا تھا۔

نکولاس نے غبن کی رپورٹ خاموشی سے سنی۔

وہ اس حقیقت سے آگاہ تھا کہ عمال حکومت میں سے ہر شخص چور ہے۔

اسے کمشنری کے حکام کو سزا دینی پڑے گی حالانکہ اس پر بھی وہ غبن کی عادت ترک نہیں کریں گے۔

چوری اور روپے کی خرد برد حکام کی کچھ فطرت ہی میں داخل ہو گئی تھی۔

آخر نکولاس نے کہا۔

"میرا خیال ہے تمام مملکت روس میں صرف ایک ہی شخص ایمان دار ہے۔ شرنیشوف فوراً سمجھ گیا کہ نکولاس کا اشارہ خود اپنی ذات کی طرف ہے۔

چنانچہ مسکرا کر بولا۔

"جی ہاں حضرت والا' یہی بات ہے۔"

نکولاس نے کہا:

"اچھا کاغذات چھوڑ جاؤ۔ میں اس کیس پر فیصلہ دے دوں گا۔"

شرنیشوف نے پھر انعام کے مستحق لوگوں کی فہرست اور جرمنی کی سرحد پر فوجی نقل و حرکت کا ذکر چھیڑا۔

نکولاس نے فہرست پر نظر دوڑائی۔

چند نام قلم زد کیے' چند بڑھائے۔ اس کے بعد استواری کا حکم دیا۔

جرمنی کی سرحد پر دو ڈویژن روانہ کر دیے جائیں۔

شاہ جرمنی نے ۱۸۴۸ء میں اپنے ملک کا آئین بخش دیا تھا۔

نکولاس اس کا متحمل نہ ہو سکا تھا۔ شاہ جرمن خود نکولاس کا سالا ہی تھا۔ چنانچہ

نکولاس یوں تو اس کے پاس دوستانہ خطوط بھیجتا اور ظاہرداری سے ملتا۔
مگر جرمنی کی سرحد پر اپنی فوجی مامور رکھنے سے نہ چوکتا۔
ممکن ہے افواج کے تعین سے نکولاس کو اپنے سالے شاہ جرمنی کو تحفہ مقصود ہو۔
کہ مبادا آئین سے ناخوش ہو کر اس کی رعایا آمادہ بغاوت ہو جائے (نکولاس کو ہر طرف سے بغاوت کا خطرہ لگا رہتا تھا۔)
نکولاس نے جس طرح ہنگری کی سرکشی کے لئے فوج استعمال کی تھی۔
نکولاس نے پھر وہی خود ستائی کے الفاظ دہرائے۔
میرے بغیر یہ بتاؤ کہ روس کا کیا حشر ہو گا۔"
شرنیشوف نے کہا۔
"جی ہاں۔" پھر بولا
"درنوخ نے حاجی مراد کے بارے میں جو تحریر کیا ہے ------"
نکولاس نے کہا۔
"اوہاں۔ یہ ابتدائے خیر ہے۔"
شرنیشوف نے کہا۔
"حضور کی سوچی ہوئی تدبیر بار آور ہو رہی ہے۔"
نکولاس تحت الشعور میں خوشامد پسند واقع ہوا تھا۔
شرنیشوف کے اپنے متعلق الفاظ سن کر خوش ہوا بلکہ مزید اپنی تعریف سننے کی خواہش کرنے لگا۔
نکولاس نے دریافت کیا۔
"تمہاری مراد کس چیز سے ہے؟"
شرنیشوف نے کہا۔
"میرا مطلب یہ ہے حضور والا کہ اگر ہم لوگ آپ کی تدبیر پر پہلے ہی عمل کر لیتے یعنی درختوں اور جنگلوں کو صاف کر دیتے تاکہ کوہستانیوں کو اناج کی سپلائی نہ پہنچ سکے تو تمام قزاق و کوہستانی بہت پہلے ہمارے زیر نگیں ہوتے۔"
"حاجی مراد کی سپر اندازی بھی اس کا تتمہ ہے۔ یہ لوگ آپ کی تدبیر کے سامنے جم نہیں سکتے تھے۔"
نکولاس نے کہا۔

"ٹھیک کہتے ہو۔" حالانکہ جنگل صاف کر کے دشمن کی سپلائی ختم کر دینے کی تجویز نکولاس کی نہ تھی بلکہ ارمولوف کی تھی۔ مگر نکولاس اس تدبیر کو اپنی ایجاد کہتا تھا۔

شاہ نکولاس کے مزاج خوشامدیوں نے اس قدر بگاڑ دئے تھے' کہ وہ انتہا درجے کا برخود غلط انسان ہو گیا تھا۔

اپنے ہر احمقانہ فعل کو عاقلانہ اقدام سمجھتا اور اپنی غلط پالیسیوں کو اعلیٰ درجے کی اسکیم تصور کرتا تھا۔

اس کے متضاد نظریات۔ انصاف سے بعید احکام اور منافقانہ افعال اس کی نگاہ میں قابل فخر ہے۔

اس کے احمقانہ فیصلے کی مثال میں اس طالب علم کا کیس پیش کیا جا سکتا ہے جس نے مبینہ اپنے پروفیسر پر حملہ کیا تھا۔

واقعہ فقط اتنا تھا کہ ایک میڈیکل طالب علم امتحان میں فیل ہو گیا۔ اس نے دوبارہ امتحان دیا اس میں بھی فیل کر دیا گیا۔ سہ بارہ امتحان دیا' پھر فیل کر دیا گیا۔

اس پر عالم یاس میں اس نے میز پر پڑے ہوئے ایک چھوٹے سے چاقو سے ممتحن پر حملہ کر دیا جس کی وجہ سے ممتحن کے خفیف سے زخم آ گئے تھے۔

نکولاس نے پوچھا۔

"اس طالب علم کا کیا نام ہے؟"

جواب دیا گیا۔

"زوسکی۔"

نکولاس نے دریافت کیا۔

"پولینڈ کا رہنے والا ہو گا؟"

جواب ملا۔

"جی ہاں اور رومن کیتھولک ہے۔"

نکولاس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

اس نے پولینڈ والوں کو بہت نقصان پہنچائے تھے۔ اور اس احمقانہ رائے کا قائل ہو گیا تھا کہ تمام پولینڈ والے بدمعاش ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان سے نفرت کرنے لگا تھا۔

نکولاس نے شرنیشوف سے کہا۔

آنکھیں بند کر لیں۔

"اچھا ذرا ٹھہرو۔" اور برائے چندے آنکھیں بند کر لیں۔

شرنیشوف جانتا تھا کہ جب نکولاس کو کوئی فیصلہ دینا ہوتا تو وہ اسی طرح آنکھ بند کر کے سوچتا تھا اور اندھا فیصلہ دے دیا کرتا تھا۔

چنانچہ اس وقت بھی نکولاس پولینڈ والوں کے خلاف نفرت کے جذبات لئے سوچ رہا تھا کہ اس پول طالب علم کو کون سی سخت سے سخت سزا دے آخر اس نے رپورٹ پر طالب علم کے خلاف بارہ ہزار کوڑوں کی سزا تحریر کر دی۔

قوی سے قوی انسان کو مار ڈالنے کے لئے چند سو کوڑے کافی ہیں۔

بارہ ہزار کوڑوں سے تو طالب علم کا قیمہ ہو جائے گا۔ لیکن جراحت و ظلم میں وہ لطف لیتا تھا۔ اس پر فخر کرتا تھا کہ اس نے روس میں سزائے موت بند کر دی تھی۔

مگر اس کے بدلے جو اس نے سزا دینے کا طریقہ اختیار کیا تھا وہ ہزار موت کے برابر تھا۔

اس نے رپورٹ پر دستخط کر کے اسے شرنیشوف کی طرف پھینکتے ہوئے کہا۔

"یہ لو پڑھو اسے۔"

شرنیشوف نے سراہتے ہوئے سر جھکایا۔

نکولاس نے مزید کہا۔

"سزا کے دن دوسرے تمام طلباء کو بھی میدان میں جمع کیا جائے' تاکہ انہیں بھی عبرت ہو۔ اس سے آئندہ وہ سر نہ اٹھا سکیں گے اور ان کے اندر بغاوت کا مادہ ختم ہو جائے گا۔

شرنیشوف نے کہا۔

"بہتر ہے حضور والا۔"

کچھ وقفہ کے بعد اس نے تاتاریوں کے متعلق رپورٹ پیش کرتے ہوئے کچھ کہا۔

شرنیشوف نے دریافت کیا۔

"پرنس درنوخ کو کیا جواب دیا جائے جناب عالی۔"

نکولاس نے جواب دیا۔

"میرے بتائے ہوئے طریقے پر عمل جاری رکھے یعنی تاتاریوں کی بستیوں کو تباہ کرنے کا سلسلہ جاری رکھا جائے۔

شرنیشوف نے پوچھا۔

"بہت بہتر۔ اچھا حاجی مراد کے متعلق کیا ارشاد ہے؟"
نکولاس بولا۔
درنوخ نے لکھا تو ہے کہ تاتاریوں کے معاملے میں وہ حاجی مراد سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔
شرنیشوف نے کہا۔
"لیکن کیا حاجی مراد پر اعتماد کر کے پرنس درنوخ غلطی کا مرتکب نہیں ہو رہا ہے؟"
نکولاس نے تیزی سے دریافت کیا۔
"تمہارا کیا خیال ہے؟"
وہ جانتا تھا کہ شرنیشوف کا ارادہ درنوخ کی رائے کے خلاف جانے کا ہو رہا ہے۔
شرنیشوف بولا۔
میری رائے میں تو احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ حاجی مراد کو وسط روس میں منتقل کر دیا جائے۔
نکولاس نے کہا۔
"مجھے تمہاری رائے سے اتفاق نہیں' بلکہ درنوخ کی رائے سے اتفاق کرتا ہوں۔ اس کے پاس یہی جواب لکھ بھیجو۔"
شرنیشوف نے کہا۔
"بہت اچھا۔"
اور آداب کر کے رخصت ہوا۔
اس کے جانے کے بعد نکولاس نے بیبکوف کو جو مغربی صوبہ جات کا گورنر جنرل تھا' طلب کیا۔
نکولاس نے بیبکوف سے کہا۔
"تم نے اچھا کیا کہ دہقانوں کو سزائیں دیں۔ ان کی یہ مجال ہوئی کہ روایات سے انحراف کرنے لگے تھے۔ جو اب تک قابو میں نہ آ سکے ہوں۔ انہیں گرفتار کر کے کورٹ مارشل کیا جائے۔
اس کے بعد اس نے ایک اخبار کے ایڈیٹر کو بھی سزا دی۔ اس ایڈیٹر نے یہ خبر شائع کی تھی کہ کئی ہزار کسانوں کو شاہی زمینوں میں کام کرنے کے لئے منتقل کیا گیا ہے۔
بیبکوف نے اس غیر منصفیانہ فیصلہ کو افسوس سے سنا۔ اس زمانے میں ریاست کے

کسان ہی ذرا آزاد تھے۔ اب انہیں سرکاری زمینوں میں لگایا جا رہا تھا۔

بیکوف اس ظلم کے خلاف احتجاج نہ کر سکا۔

بیکوف کو رخصت کرنے کے بعد نکولاس دراز ہو گیا۔

جیسے اس نے بڑے عدل و انصاف کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس کے بعد گھنٹے کو دیکھا پھر باہر جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

شان دار وردی زیب تن کر کے وہ کمرہ استقبالیہ میں آیا۔

جہاں تقریباً سو مرد و عورت ادب سے قطار باندھے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ مرد وردی میں تھے اور عورتیں نیم عریاں لباس میں۔

وہ آنکھوں میں عدم دلچسپی لئے ان کے قریب آیا۔

اس کا سینہ کسا ہوا تھا اور توند نکلی ہوئی تھی۔ حاضرین میں سے بہت سے لوگ صورت آشنا بھی تھے۔ ان سے اس نے دو چار باتیں کیں۔

وہ گرجا۔

ان لوگوں سے سال نو کی مبارک باد لیتا ہوا چلا گیا۔

جہاں خدا اپنے پجاریوں کے ذریعے نکولاس کی تعریف کیا کرتا تھا (یعنی پادری باخدا ہوتے ہوئے بھی نکولاس جیسے ذلیل بادشاہ کی چاپلوسی کرتے تھے۔

بہرحال یہ معمول تھا گویا کہ عالم کی فلاح کا بار صرف نکولاس کے کاندھوں پر تھا اور جیسے وہی جہان کا نجات دہندہ تھا۔

سروس کے دوران میں نکولاس نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔

اور اس کی نگاہ نیلی رودا پر پڑی (وہی کل والی دوشیزہ جس کے ساتھ اس نے کچھ وقت مسرت گزارا تھا) حسین نیلی رودا ایک بیوہ عورت کے متصل کھڑی تھی۔ یہ تضاد خوب تھا۔

یہاں سے فارغ ہو کر نکولاس ملکہ کے پاس پہنچا۔

اور چند منٹ اپنے اہل و عیال کے ساتھ گزارے پھر روانہ ہوا۔

تصاویر کی گیلری سے گزرتا ہوا کورٹ منسٹر سے ملا اور اسے حکم دیا۔ کہ سالانہ پنشن کے فنڈ سے کچھ روپیہ کل والی اپنے زیر تصرف لڑکی کی ماں کو دے دے۔

آج کا ڈنر بڑا شاندار تھا۔

اپنے چھوٹے بچے اور اپنے بھائی مائیکل کے لڑکے کے علاوہ بڑے بڑے امراء و روساء سفیر اور ایلچی وغیرہ بھی مدعو تھے۔

لوگ ابھی شہنشاہ اور ملکہ کی آمد کے منتظر ہی تھے کہ نواب لیوین اور جرمنی کے سفیر کے درمیان ایک دلچسپ بحث چھڑ گئی جو پولینڈ کے متعلق تھی۔

لیوین نے کہا۔

"پولینڈ اور تاتاری علاقہ یہ دونوں روس کے لئے ناسور کی حیثیت رکھتے ہیں۔"

سفیر جرمنی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہوں گے۔"

بات آگے بڑھنے والی تھی کہ ملکہ اپنی کپکپاتی گردن اور قائم تبسم لئے ہال میں داخل ہوئی۔

کھانے کے دوران نکولاس بولا۔

اس کے ساتھ نکولاس۔

"حاجی مراد ہمارا مطیع ہو چکا ہے۔ اس لئے اور تاتاریوں سے تو ہماری جنگ ختم ہی سمجھو۔"

اس نے پھر کہا۔

"چنانچہ میں نے ان کی آماجگاہوں کا صفایا کرنے کے لئے جنگلوں کو کاٹ ڈالنے کا حکم صادر کر دیا ہے۔

جرمنی کے سفیر نے چپکے سے اے ڈی سی کی طرف دیکھا۔

صبح ہی تو اس نے اے ڈی سی سے کہا تھا کہ نکولاس کی احمقانہ کمزوریوں میں سے ایک بڑی کمزوری یہ بھی ہے کہ وہ خود کو سیاست کا دیوتا سمجھتا ہے۔

بہرحال اس وقت اس کی چاپلوسی میں بولا۔

"اس سے بہتر کوئی تدبیر نہیں ہو سکتی تھی۔"

کھانے کے بعد نکولاس رقص و سرود کی محفل میں پہنچا۔

یہاں بے شمار عورتیں تقریباً نیم برہنہ موجود تھیں۔ ان میں سے ایک نے خصوصی طور پر اس کی توجہ کو جذب کیا۔

دوسرے روز حسب معمول شرنیشوف مختلف رپورٹیں لے کر حاضر ہوا۔

شرنیشوف کے سوال پر حاجی مراد کے مسئلہ میں نکولاس نے کہا۔

"میں دوبارہ درنوخ کی رائے کی توثیق کرتا ہوں۔"

نکولاس نے مزید کہا۔

"اب چونکہ حاجی مراد مطیع ہو چکا ہے۔ چنانچہ تاتاریوں کی بستیوں کو گھیر لیا جائے اور ان پر حملے شروع کر دیے جائیں۔"

چنانچہ یہی نکولاس کا جواب لکھ کر شرنیشوف نے درنوخ کے پاس روانہ کر دیا۔

پھر کئی روز کی مارا مار مسافت طے کرتا ہوا ایک سوار طفلس پہنچا اور بادشاہ کا مراسلہ درنوخ کو پیش کیا۔

شاہ نکولاس کے اس حکم کی تعمیل میں فوراً ہی جنوری ۱۸۵۳ء میں روسی افواج نے
تاتاری بستیوں پر ناروا حملے شروع کر دیئے۔
حملہ آور افواج چار بٹیلین انفینٹری۔ دو قزاقوں کی کمپنی اور آٹھ ضرب توپ پر مشتمل
تھی۔

پہاڑی نشیب و فراز کو طے کرتی ہوئی فوج بڑھتی چلی جا رہی تھی۔
دشمن کی سرحد کے قریب مارچ کرتے وقت معمولاً بڑی خاموشی سے کام لیا گیا۔
صرف وقتاً" فوقتاً" یا تو توپوں کے پہیوں کی پتھریلے راستے پر گڑگڑاہٹ ہو جاتی تھی یا
کبھی گھوڑوں کے ہنہنانے کی آواز آتی تھی ورنہ خاموشی رہتی تھی۔
افسر بھی فوج کو تیز یا آہستہ چلنے کا حکم پست لہجے میں دیتے تھے۔ بس ایک بار خاموشی
ٹوٹی تھی جب کہ ایک دو نیل گائے آدمیوں کو دیکھ کر جنگل میں بدک کر بھاگی تھیں۔
سردی کا زمانہ تھا، مگر دوپہر کو دھوپ میں کافی تیزی ہو جاتی تھی۔ تیز دھوپ میں چمکیلی
توپیں اور برہنہ سنگوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سورج کی شعاعیں نکل رہی ہیں۔
شفاف چشمہ جسے فوج نے عبور کر لیا تھا اب کافی پیچھے رہ گیا تھا۔ آگے نشیبی وادیوں
میں جوتے ہوئے کھیت اور سرسبز چراگاہیں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان سے آگے سیاہ و پراسرار
پہاڑی چوٹیاں تھیں۔
اور ان سے بھی آگے، بلند چوٹیاں برف سے ڈھکی ہوئی دور سے ایسی نظر آ رہی تھیں
جیسے بڑا سا ہیرا ہو۔
پانچویں کمپنی کے افسر کا نام بٹلر تھا۔
بٹلر ایک لمبا چوڑا اور وجیہہ نوجوان تھا جس کا حال ہی میں یہاں تبادلہ ہوا تھا۔
امنگوں سے بھرا ہوا۔ زندگی سے مامور اور موت کے خطرات سے آگاہ کارکردگی کا
خواہاں تھا۔
کسی مہم پر نکلنے کے سلسلے میں یہ اس کا صرف دوسرا موقع تھا۔
اسے احساس تھا کہ چند لمحات بعد ہی اسے دشمن کی بندوقوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔
گولیوں کو اپنی طرف آتا دیکھ کر وہ رکے گا نہیں بلکہ شجاعانہ سربلند کئے بڑھتا چلا جائے گا۔

نہیں بلکہ مسکراہٹ سے دیکھے گا۔
اور اپنے ساتھیوں کی طرف ہراس سے
سڑک کو چھوڑ کر اب فوج کو ایک پگ ڈنڈی پر مڑ جانا پڑا۔
وہ گھنا جنگل طے کر ہی رہے تھے کہ نامعلوم کس طرف سے دفعتہ" بندوق کا دھماکا ہوا
اور سیٹی بجاتا ہوا ایک گولہ سامان کی گاڑی پر آکر لگا۔
بٹلر نے مسکرا کر اپنے ایک ساتھی سے کہا۔

"چلو ابتدا ہو گئی۔"

واقعی ابتدا ہو چکی تھی۔ کیونکہ گولے کے بعد پہاڑی تاتاریوں کا سوار دستہ نمودار ہوا
جس کے وسط پر ایک بڑا سا سبز جھنڈا لہرا رہا تھا۔
ایک بوڑھے اور تجربے کار افسر نے ناتجربہ کار بٹلر سے کہا۔
"اس دستے کی کمان شاید خود شمل ہی کے ہاتھ میں ہے۔"
پھر یہ دستہ پہاڑی نشیب کو طے کر کے روسی بٹیلین سے ذرا قریب ہوا۔
ایک افسر نے دوڑ کر آتے ہوئے بٹلر سے کہا۔
"جلدی سے مقابلے کے لئے تیار ہو جایئے۔"
بٹلر جلدی سے سنبھلا مگر ابھی وادی کی طرف بڑھا ہی تھا کہ توپ کے دو گولوں کا اس
کے عقب میں دھماکا ہوا اور وادی دھواں دھار ہو گئی۔
پہاڑی اپنا اتنا ہی کام کر گئے۔ وہ روسی توپ خانہ اور سواروں سے ڈٹ کر لڑنا نہیں
چاہتے تھے۔
چنانچہ انہوں نے پسپائی اختیار کی۔ لیکن روسیوں نے ان پر گولیاں برسانا شروع
کیں۔ چند ہی منٹ میں تمام فضا دھوئیں سے اٹ گئی۔
آس پاس کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ البتہ پہاڑیوں کی بلندی پر سے پسپا ہوتے ہوئے
تاتاری دکھائی دے رہے تھے جو اپنے تعاقب کنندگان پر بندوقیں سر کرتے چلے جا رہے
تھے۔

بٹلر دور تک تعاقب کرتا ہوا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اس کے دستے کو ایک پہاڑی نشیب
کے بعد کسی تاتاری بستی کے نشانات نظر آئے۔
چنانچہ روسی سپاہ بستی میں داخل ہوئی مگر وہاں کسی متنفس کے آثار نہ تھے سپاہیوں نے
اناج۔ گھاس۔ اور مکانات میں آگ لگا دی۔ چند ہی منٹ میں آگ کے شعلے بلند ہونے
لگے اور وادی دھوئیں سے بھر گئی۔

تاتاری بستی سے اپنے جانور اور مرغا مرغیت نہ لے جا سکے تھے۔ ان کی سپاہیوں نے دعوت اڑائی۔

اس کے بعد آفیسر دھوئیں سے ہٹ کر ایک ٹیلے پر جا بیٹھے اور کھانا کھانے لگے۔ شراب اڑانے لگے۔

آس پاس دور تک کسی متنفس کا وجود نہ تھا۔ چنانچہ دوپہر تک فوج کو واپسی کا حکم دیا گیا۔

فوج جونہی پیچھے ہٹی۔ پہاڑیوں پر سے تاتاریوں نے گولیاں برسانا شروع کیں۔ لیکن میدان آنے پر انہوں نے تعاقب ترک کر دیا اور چلے گئے۔

بٹلر کی کمپنی میں سے کوئی زخمی تک نہ ہوا۔ وہ بڑے مسرور موڈ میں لوٹ رہا تھا۔

جب فوج اسی چشمے کے قریب پہنچی تو سپاہی پھیل گئے اور خوشی کے گیت گانے لگے۔

بٹلر بہت خوش تھا اور اس چھوٹی سی جھڑپ کو معرکہ عظیم سمجھ رہا تھا اس کا خیال تھا کہ اس "جنگ" کے بعد اس کے ساتھی اس کی دلیری سے مرعوب ہو گئے ہوں گے اور دور دور تک اس کے دوست اس کی شہرت سے متاثر ہوں گے کہ وہ کس قدر جیوٹ ہے کہ جان کی بازی لگا کر دشمنوں سے نبرد آزما ہوتا ہے۔

تعجب ہے کہ بٹلر کے ذہن میں جنگ کا دوسرا رخ نہیں آ رہا تھا جس میں افسر اور سپاہی زخمی ہوتے ہیں' مارے جاتے ہیں۔

اسی فوج کے دوسرے دستے میں تین سپاہی مرے تھے اور بارہ زخمی ہوئے تھے۔ مگر بٹلر نے مردوں کی طرف دیکھنا گوارا بھی نہیں کیا۔

اس نے زخمیوں اور مردوں کے گولیوں سے شگاف سینوں پر نظر تک نہ ڈالی۔ بس اپنے شاعرانہ تخیل میں مگن رہا۔

ہوا بند تھی اور تمام فضا اس قدر شفاف تھی کہ سو میل کے فاصلے پر برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑی چوٹیاں بالکل صاف نظر آ رہی تھیں۔

بٹلر اپنے سے بڑے افسر میجر پتروف کے ساتھ چلا جا رہا تھا۔

بٹلر اسی کے پاس ٹھہرا تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ میجر کو اس کے آنے کی اور یہاں کے تبادلے کی خوشی نہیں ہوئی تھی۔

گارڈ کے دستے سے بٹلر کا یہاں تبادلہ اس وجہ سے ہوا تھا یا اس نے خود اپنا تبادلہ اس سبب سے کرا لیا تھا کہ وہ وہاں رات دن جوئے میں مصروف رہنے لگا تھا۔

اور ہارتے ہارتے اس قدر مقروض ہو گیا تھا کہ اس کے پاس اپنی عزیز جان کے علاوہ کچھ باقی نہ رہا تھا۔

میجر پتروف اپنے طور پر خوش دل انسان تھا۔

میجر نے اپنے سارجنٹ کے اردلی کی لڑکی کو بیوی بنا رکھا تھا اس لڑکی کا پہلا نام ماشا تھا مگر میجر کی بیوی ہو جانے کے بعد عزت کے طور پر اسے ماریہ کہا جانے لگا تھا۔

ماریہ ایک حسین عورت تھی' آزاد و زندہ دل۔ اس کی عمر تیس کے قریب تھی۔ مگر اب تک کسی بچے کی ماں نہیں ہوئی تھی۔

اس کی پچھلی زندگی خواہ کیسی ہی گزری ہو مگر اب وہ میجر کی بیوی تھی۔

جب وہ قلعہ میں واپس لوٹے تو میجر پتروف نے ہر چیز حسب معمول پائی۔ ماریہ نے بٹلر کو اور دو تین فوجی افسروں کو عمدہ کھانا کھلایا۔ شراب پلائی۔

میجر نے تو اس قدر پی کہ بات کرنے کے قابل نہ رہا چنانچہ لڑکھڑاتا ہوا سونے کے لئے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ بٹلر نے بھی خوب پی تھی وہ بھی جا کر اپنے کمرے میں دراز ہو گیا اور جلد اسے نیند آ گئی۔

جس قصبہ کو یہ روسی فوج ابھی تباہ کر کے آئی تھی۔ یہ وہی بستی تھی جس میں حاجی مراد نے سیدو کے مکان کے اندر ایک شب کے لئے پناہ لی تھی' اور آدھی رات کے بعد وہاں سے نکل کر اسے خود کو روسی حکومت کے سپرد کر دیا تھا۔

سیدو اور اس کی فیملی نے روسیوں کے پہنچنے سے پہلے ہی اس بستی کو خالی کر دیا تھا۔

جب یہ طوفان ٹل گیا تو سیدو بستی میں آگیا۔ مگر یہاں اپنے مکان' اناج' مویشی اور درو دیوار کو خاکستر دیکھ کر فرط غم سے اس کا کلیجہ مونہہ کو آگیا۔

سب سے بڑا صدمہ یہ تھا کہ اس کا پندرہ سالہ چمک دار آنکھوں والا خوب صورت لڑکا (جس نے اس شب کو حاجی مراد کی اس قدر تواضع کی تھی) مسجد میں مردہ پایا گیا۔

اس کے جسم پر سنگین کا گہرا زخم تھا جس میں سے اس کا جوان خون حیات بہہ گیا تھا۔

اور سیدو کی معزز اور رکھ رکھاؤ والی بیوی جس نے حاجی مراد کو بڑے اہتمام سے کھانا کھلایا تھا۔ فرط غم سے اپنے بچے کی موت پر خون کے آنسو بہا رہی تھی۔

اس کا لباس پاگلوں کی طرح تار تار تھا۔ اس کا مرجھایا ہوا سینہ لٹک رہا تھا۔ بال پریشان تھے اور سوگ میں اس نے ناخنوں سے اپنے کلے زخمی کر لئے تھے۔

سیدو اور اس کے ساتھی مل کر پھاوڑے سے اس نو عمر میت کے لئے قبر تیار کر رہے تھے۔

اور لڑکے کا دادا (جس نے سب سے پہلے حاجی مراد کو خوش آمدید کہا تھا۔ دیوانوں کی طرح فرط غم سے ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا تھا۔

گھر کا تمام سامان جلا کر خاکستر کر دیا گیا تھا۔

باغیچہ کے پھل دار درخت مرجھائے پڑے تھے۔ شہد کی مکھیوں کا چھتہ اجڑ گیا تھا۔ عورتوں کا واویلا۔ بچوں کی سسکیاں اور جلنے سے بچے ہوئے بھوکے جانوروں کا ڈکرانا ایک رقت خیز منظر پیش کر رہا تھا۔

ذرا سیانے لڑکے اپنا سب کھیل کود بھول گئے تھے اور اپنے والدین کے شریک غم ہو کر سہمے ہوئے بیٹھے تھے۔

فوارے کو توڑ ڈالا گیا تاکہ پانی کا وجود باقی نہ رہے۔ اسی طرح مسجد میں گندگی پھیلا دی

گئی تھی جسے ملا اور اس کے ساتھی صاف کرنے میں مصروف تھے۔ کسی کے مونہہ سے کوئی کلمہ نہیں نکل رہا تھا۔ روسی مظالم کے خلاف نفرت کے کلمات میں ان کی زبانیں بند تھیں۔

کیوں کہ بچے سے لے کر بوڑھے تک کے دل میں روسیوں کے خلاف نفرت سے کہیں زیادہ قوی جذبات گھول رہے تھے۔

نفرت تو ایک بہت معمولی لفظ تھا۔

روسی کتے۔ وحشی۔ آدم خور قوم۔ یہ شیطانی ناچ۔ یہ بربریت۔ انسان کا کام نہیں ہو سکتا تھا۔ اس طرح تو کوئی کیڑے مکوڑوں کے ساتھ بھی پیش نہیں آتا!

بات صرف اتنی سی تھی کہ حاجی مراد کی فیملی شیمل کے چنگل میں پھنس گئی تھی۔

شیمل کے ساتھ چونکہ جمعیت کثیر تھی اور حاجی مراد تقریباً تنہا تھا اس لئے وہ شیمل سے جنگ کر کے اپنے اہل و عیال کو رہائی دلانے سے قاصر تھا۔

آخر اس کے ذہن میں یہ تدبیر آئی تھی کہ روسی حکومت سے مدد لے۔ اگر روسی حکومت اپنے تیس چالیس اسلح بند سپاہی اس کے ہمراہ کر دیتی تو وہ شیمل کو شکست دے کر اپنے بال بچوں اور ماں کو اس کے پاس سے نکال لاتا۔

خود کو روسی حکومت کے سپرد کرتے وقت یہی شرط اس نے پیش کی تھی۔ اس کی اس شرط کو پرنس درنوخ نے نہ صرف تسلیم ہی کیا تھا بلکہ اس باب میں ایک طویل سفارشی چٹھی لکھ کر طفلس سے شرنیشوف وزیر دفاع کے پاس روانہ کی تھی تاکہ زار روس سے اس کی منظوری مل جائے۔

شاہ نکولاس نے پرنس درنوخ کی رائے سے اتفاق تو کیا تھا مگر چونکہ احمق و مدبر ناآشنا بادشاہ تھا۔

اس نے حاجی مراد کی معیت میں شیمل کی سرکوبی کے لئے تیس چالیس آدمی روانہ کرنے کا حکم دینے کے بجائے ایک پوری فوج شیمل سے لڑنے کے بجائے تمام تاتاری مسلمانوں کی بستیاں تباہ کرنے کے لئے روانہ کر دی۔

جس کے کارنامے پچھلے ابواب میں ظاہر کئے جا چکے ہیں۔

حاجی مراد تو اپنی قوم کا غدار تھا اور نہ اپنے قبیلے کا۔

بلکہ جس زمانے میں اس کے پاس کچھ اپنے سپاہی تھے تو اس نے کئی محاذوں پر بڑے بڑے روسی جرنلوں کو شکست فاش دی تھی۔

گئی تھی جسے ملا اور اس کے ساتھی صاف کرنے میں مصروف تھے۔ کسی کے مونہہ سے کوئی کلمہ نہیں نکل رہا تھا۔ روسی مظالم کے خلاف نفرت کے کلمات میں ان کی زبانیں بند تھیں۔

کیوں کہ بچے سے لے کر بوڑھے تک کے دل میں روسیوں کے خلاف نفرت سے کہیں زیادہ قوی جذبات گھول رہے تھے۔

نفرت تو ایک بہت معمولی لفظ تھا۔

روسی کتے۔ وحشی۔ آدم خور قوم۔ یہ شیطانی ناچ۔ یہ بربریت۔ انسان کا کام نہیں ہو سکتا تھا۔ اس طرح تو کوئی کیڑے مکوڑوں کے ساتھ بھی پیش نہیں آتا!

بات صرف اتنی سی تھی کہ حاجی مراد کی فیملی شیمل کے چنگل میں پھنس گئی تھی۔

شیمل کے ساتھ چونکہ جمعیت کثیر تھی اور حاجی مراد تقریباً تنہا تھا اس لئے وہ شیمل سے جنگ کر کے اپنے اہل و عیال کو رہائی دلانے سے قاصر تھا۔

آخر اس کے ذہن میں یہ تدبیر آئی تھی کہ روسی حکومت سے مدد لے۔ اگر روسی حکومت اپنے تیس چالیس اسلحہ بند سپاہی اس کے ہمراہ کر دیتی تو وہ شیمل کو شکست دے کر اپنے بال بچوں اور ماں کو اس کے پاس سے نکال لاتا۔

خود کو روسی حکومت کے سپرد کرتے وقت یہی شرط اس نے پیش کی تھی۔ اس کی اس شرط کو پرنس درنوخ نے نہ صرف تسلیم ہی کیا تھا بلکہ اس باب میں ایک طویل سفارشی چٹھی لکھ کر طفلس سے شرنیشوف وزیر دفاع کے پاس روانہ کی تھی تاکہ زار روس سے اس کی منظوری مل جائے۔

شاہ نکولاس نے پرنس درنوخ کی رائے سے اتفاق تو کیا تھا مگر چونکہ احمق و مدبر ناآشنا بادشاہ تھا۔

اس نے حاجی مراد کی معیت میں شیمل کی سرکوبی کے لئے تیس چالیس آدمی روانہ کرنے کا حکم دینے کے بجائے ایک پوری فوج شیمل سے لڑنے کے بجائے تمام تاتاری مسلمانوں کی بستیاں تباہ کرنے کے لئے روانہ کر دی۔

جس کے کارنامے پچھلے ابواب میں ظاہر کئے جا چکے ہیں۔

حاجی مراد تو اپنی قوم کا غدار تھا اور نہ اپنے قبیلے کا۔

بلکہ جس زمانے میں اس کے پاس کچھ اپنے سپاہی تھے تو اس نے کئی محاذوں پر بڑے بڑے روسی جرنلوں کو شکست فاش دی تھی۔

یہی وجہ تھی کہ حاجی مراد کے ازخود مطیع ہو جانے کی پرنس درنوخ کو بڑی خوشی ہوئی تھی۔

حاجی مراد کو بالکل معلوم نہ تھا کہ روسی فوج شمل سے لڑنے کے بجائے اور اس کی (حاجی مراد کی) فیملی کو آزادی دلانے کے بدلے آس پاس کی تاتاری بستیوں کو تباہ کر آئی ہے۔

اگر اسے روس والوں کے اس سیاہ کارنامے کا علم ہو جاتا تو وہ ایک لمحہ کے لئے روسی سرحد میں نہیں رکتا۔ بلکہ واپس بیتابانہ اپنی قوم کو بچانے کے لئے چلا جاتا۔

ہوا یہی ـــــ آگے کے ابواب اس ٹریجڈی کی آپ نقاب کشائی کر دیں گے۔

غرض اس تاتاری بستی والے تباہ انسان واپس اپنے تباہ شدہ قصبے میں آکر آباد ہونے لگے۔

بے خانماں و تباہ حال۔ اس کے علاوہ کرتے کیا۔ کہاں جاتے۔

اس بستی کو انہوں نے کسی زمانے میں اپنا خون پسینہ ایک کر کے بسایا تھا مگر روسیوں نے کتنی آسانی سے اس کو تباہ کر دیا تھا۔

اب بھی بستی والوں کو ہر دم یہی خطرہ لگا رہتا تھا کہ نامعلوم کب دوبارہ روسی درندے ان پر آ ٹوٹیں اور انہیں اپنا غلام بنا لیں پھر ان کے مذہب و تہذیب کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔

بوڑھے رات دن مصروف دعا رہتے تھے کہ خدا مسلمانوں کو آئندہ شیاطین کے شر سے محفوظ رکھے۔

آخر لوگوں نے یہ طے کیا کہ شمل کے پاس امداد کے لئے آدمی بھیجے جائیں۔

بہرحال اس وقت وہ بار دیگر بستی کے بسانے کے کاموں میں تندہی سے مصروف ہو گئے۔

تاتاری بستی پر حملہ کرنے کے دوسرے روز بٹلر صبح اٹھ کر چہل قدمی کو نکل گیا۔

کیونکہ ناشتہ کا وقت دور تھا۔ وہ میجر پتروف کے ساتھ ہی ناشتہ کیا کرتا تھا۔

ابھی آفتاب طلوع ہی ہوا تھا۔ بڑا سہانا سماں نظر آ رہا تھا۔

دور برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑیاں اور سرسبز نشیب بہت دل فریب منظر پیش کر رہے تھے۔

اس کے بعد بٹلر نے اس کوہستانی حصار پر نظر ڈالی۔

جہاں وہ کل خون کی ہولی کھیل کر آیا تھا اور خوش ہو رہا تھا کہ خود زندہ ہے' زندگی کا لطف اٹھا رہا ہے۔

اس کو اس کی بھی خوشی تھی کہ کل والی مہم کو اس نے کامیابی سے سر کیا۔

چڑھائی بھی کامیاب رہی اور پسپائی میں بھی زیادہ نقصان نہ ہوا۔

اس کے بعد اسے ماشا ماریہ کا خیال آیا کہ پتروف کی موجودگی کے باوجود اس نے کھانے پر کس قدر اس کی (بٹلر کی) تواضع کی تھی۔ اور التفات خاص سے اس کو نوازا تھا۔

ماریہ کا گداز جسم' اس کا شگفتہ تبسم۔ دل کش سینہ اور کولھے اس کی ادائے گفتگو وغیرہ میں بٹلر کو بے حد کشش محسوس ہوتی تھی۔

بٹلر چونکہ تندرست اور کنوارا نوجوان تھا اسے ایسی ہی عورتوں کی تمنا تھی۔

بعض اوقات تو بٹلر کو ایسا محسوس ہونے لگتا تھا جیسے ماریہ کو اس کی ضرورت ہے۔ مگر سیدھی طبیعت والے اپنے افسر میجر پتروف کے احترام میں یہ خیال اس نے دل سے نکال دیا۔

ابھی وہ انہی خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ قریب میں گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سے چونکا۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو روسی قزاقوں کا ایک دستہ چلا آ رہا تھا۔

جن کے درمیان میں ایک شخص سفید اور اونچی کلاہ پہنے گھوڑے پر سوار تھا اور اس کے قریب ایک روسی افسر تھا' جس کے شانے پر اعزازی نشانات تھے۔

سفید کلاہ والا شخص ایک کمیت پر سوار تھا اور اس کی سیاہ آنکھیں بڑی خوب صورت معلوم ہو رہی تھیں۔

آفیسر نے بٹلر سے دریافت کیا۔

"کیا میجر صاحب کا یہی مکان ہے؟"

بٹلر نے افسر سے دریافت کیا۔

"ہاں۔ آپ کہاں سے آ رہے ہیں اور آپ کے ساتھ یہ کون شخص ہے؟"

افسر نے جواب دیا۔

"یہ حاجی مراد ہے اور میجر کے پاس رہنے آیا ہے۔"

بٹلر نے حاجی مراد کا تذکرہ سنا تھا۔

اور اسے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ وہ روسیوں سے آ ملا ہے لیکن وہ اسے اس چھوٹے سے قلعہ میں دیکھنے کا متوقع نہ تھا۔

حاجی مراد نے دوستانہ انداز میں بٹلر کی طرف دیکھا۔
بٹلر نے اس سے کہا۔
"سلام حاجی مراد۔"
حاجی مراد نے جواب دیا۔
"سلامت رہو۔"
اور اس سے مصافحہ کیا۔
حاجی مراد نے اس سے پوچھا۔
"کیا یہاں کے افسر تم ہی ہو؟"
بٹلر نے کہا۔
"نہیں۔ افسر اندر موجود ہے۔ میں جا کر اسے بلاتا ہوں۔"
سیڑھیاں طے کر کے اندر گیا مگر اندر سے دروازہ بند تھا۔
بٹلر مکان کے پیچھے پہنچا' پھر اردلی کو بلایا مگر اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔
آخر برآمدے میں سے ہو کر باورچی خانے میں داخل ہوا۔

وہاں ماریہ سر سے خوب صورت رومال باندھے ہوئے ناشتہ تیار کرنے میں مصروف تھی۔ اس کی آستین ٹوٹی ہوئی تھی جس سے اس کی سفید کلائی اور بھرے بھرے بازو نظر آ رہے تھے۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرائی۔

بٹلر نے اس سے پوچھا۔
"سب لوگ کہاں غائب ہیں؟"
ماریہ بولی۔
"پینے پلانے"
پھر اس نے کہا۔
"کیا کام ہے؟"
بٹلر نے جواب دیا۔
"سامنے کا دروازہ کھلوانا تھا کیونکہ باہر بہت سے آدمی آئے ہوئے ہیں۔ حاجی مراد بھی آیا ہے۔"
ماریہ نے مسکرا کر کہا۔
"خوب جھوٹ بولنا آتا ہے آپ کو۔"

بٹلر نے کہا۔

"میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ واقعی وہ باہر انتظار کر رہا ہے۔"

ماریہ بولی۔

"کیا سچ مچ؟"

بٹلر نے کہا۔

"میں آپ سے جھوٹ کیوں بولتا' خود جا کر دیکھ لیجئے۔"

ماریہ بولی۔

"خوب آیا"

اور جلدی سے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرا کہ آیا آراستہ تو ہیں۔ پھر آستین اتار لیں۔

ماریہ نے کہا۔

"میں ابھی جا کر پتروف کو بھی بیدار کرتی ہوں۔"

بٹلر نے ذرا توقف کیا پھر بولا۔

"نہیں میں جاتا ہوں۔"

اس کے بعد ملازم سے مخاطب ہوا۔

"تم جا کر دروازہ کھولو۔"

ماریہ نے کہا۔

"اچھی بات ہے۔"

اور اپنے کام میں وہ پھر مصروف ہو گئی۔

میجر پتروف کو یہ تو معلوم تھا کہ حاجی مراد غروزنی میں آیا ہوا ہے۔

جب اسے یہ اطلاع ہوئی کہ وہ اس وقت اس کے در پر موجود ہے تو اسے زیادہ تعجب نہ ہوا۔

بہرحال پتروف اٹھا۔ کلی غرارے سے فارغ ہوا۔

پھر اپنے ملازم سے بولا۔

دوا لاؤ۔

ملازم جانتا تھا کہ دوا سے اس کی کیا مراد ہے۔ چنانچہ ووڈکا (شراب) لے آیا۔

اس کے بعد اٹھ کر ملاقات کے کمرے میں آیا جہاں بٹلر نے پہلے ہی سے حاجی مراد اور اس کے ساتھ آئے ہوئے افسر کو بٹھا دیا تھا۔

افسر نے میجر پتروف کو بائیں بازو کے کمانڈر کا حکم نامہ دیا۔

اور بولا۔

"کمانڈر صاحب نے کہا کہ آپ حاجی مراد کو اپنے پاس رکھیں اور اسے جاسوسوں کے ذریعہ اپنے کوہستانی باشندوں سے ملنے جلنے کی اجازت دیں۔

لیکن اسے کسی قیمت پر بھی سپاہیوں کی نگرانی کے بغیر قلعہ سے باہر جانے کی اجازت نہ دیں۔"

کاغذات پڑھنے کے بعد میجر نے غور سے حاجی مراد کو دیکھا اور پھر کاغذ پر نظر ڈالی۔ دو چار بار اسی چیز کا اعادہ کرنے کے بعد اس نے حاجی مراد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیشی بیک یکشی (بہت اچھا جناب بہت اچھا) کمانڈر کا حکم سر آنکھوں پر۔ حاجی مراد سے کہہ دو کہ اسے قلعہ سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہے۔ اچھا بٹلر اسے کہاں ٹھیرائیں۔ کیا اس دفتر میں؟"

ابھی بٹلر جواب بھی نہیں دینے پایا تھا کہ ماریہ باورچی خانے سے نمودار ہوئی۔ دروازہ میں آکر بولی۔

"اسے دفتر میں کیوں ٹھیرایا جائے۔ ہم اسے مہمانوں کا کمرہ اور اسٹور دے سکتے ہیں۔ اس سے یہ ہو گا کہ ہماری آنکھوں کے سامنے رہے گا۔"

پھر اس نے حاجی مراد کی طرف دیکھا۔ مگر اس کی نگاہوں کی تاب نہ لا کر دوسری طرف رخ کر لیا۔

بٹلر نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ ماریہ کی رائے درست ہے۔"

میجر نے پیشانی پر بل ڈال کر کہا۔

"عورتوں کو ہر معاملے میں بولنے کی ضرورت نہیں چلی جاؤ۔"

اس تمام گفتگو کے دوران میں حاجی خاموش بیٹھا رہا۔ اس کا ہاتھ پیش قبض پر تھا اور لبوں پر خفیف سی حقارت

"مجھے اس سے بحث نہیں کہ کہیں بھی ٹھیرایا جاؤں۔ میں تو اس وعدہ کی تکمیل چاہتا ہوں جو سردار (پرنس درنوخ) نے کیا ہے یعنی مجھے کو ہستانیوں سے سلسلہ جنبانی کی اجازت دی جائے اور کوہستانیوں کو بھی مجھ سے ملنے جلنے کی اجازت رہے۔"

میجر نے کہا۔ اس کے بعد بٹلر سے مخاطب ہوا

"ایسا ہی ہو گا۔"

"جب تک تم ان کی کچھ تواضع کرو۔ ناشتہ تیار ہونے تک اور اس کے قیام کے انتظام تک مہمانوں کی مدارات میں رہو۔ میں آفس میں جا کر ضروری ہدایات تیار کرتا ہوں۔"

اپنے اور ان نئے شناساؤں کے تعلقات کا حاجی مراد نے جلد اندازہ لگا لیا کہ میجر حقارت سے پیش آ رہا تھا۔ حاجی مراد بھی اس سے غرور سے بات کرتا رہا۔

ماریہ جس نے حاجی مراد کے لئے ناشتہ تیار کیا تھا اسے پسند آئی تھی۔

اسے اس کی سادگی اور حسن کی بے پرواہی بہت بھائی تھی اور وہ بھی اس سے متاثر

ہوئی تھی۔ حاجی کو اس کی مسرت تھی۔

اس نے اس کی جانب بار بار دیکھنا یا اس سے بات کرنا مناسب نہ سمجھا۔ لیکن پھر بھی اس کی نگاہیں ماریہ کا تعاقب کرنے لگتی تھیں۔

بٹلر سے ملاقات ہوتے ہی حاجی مراد کا اس سے دوستانہ ہو گیا تھا۔

اس سے وہ بے تکلفانہ باتیں کرتا تھا اپنی کہتا اس کی سنتا اسے بتاتا کہ جاسوس اس کی (حاجی مراد کی) فیملی کے متعلق کیسی تکلیف وہ خبر لائے ہیں۔ اس سے مشورہ بھی کر لیتا کہ اب کیا قدم اٹھانا چاہیے۔

جاسوس جتنی بار اس کے پاس خبریں لائے۔ وہ بری ہی تھیں۔

شروع کے چار روز تک تو وہ بری ہی خبریں سنتا رہا اور سوچتا رہا۔ اسے کسی شدید فکر نے گھیر لیا تھا۔

جس زمانے میں حاجی مراد روسیوں سے آ کر مل گیا تھا تو اس کے چند روز بعد ہی اس کی فیملی کو یدنیو میں منتقل کر دیا گیا تھا۔
وہاں اس کے اہل و عیال حراست میں تھے اور ان کے بارے میں شیمل کے حکم کا انتظار کیا جا رہا تھا۔
حاجی مراد کی ماں، اس کی دونوں بیویاں اور پانچ بچے قید کر دئے گئے اور ابراہیم رشید ان کی قید کا نگراں تھا۔
حاجی مراد کا اٹھارہ سالہ نوجوان لڑکا یوسف ایک سات آٹھ فیٹ گہرے گڑھے میں قید تھا۔
اس گہرے اور تنگ گڑھے میں اسی جیسے بے گناہ سات مجرم اور قید تھے جو اپنے نوشتہ تقدیر کا انتظار کر رہے تھے۔
ان قیدیوں کے متعلق فیصلہ میں یوں دیر ہو رہی تھی کہ شیمل کسی محاذ پر روسیوں سے جنگ آزمائی میں مصروف تھا۔
آخر چھ جنوری ۱۸۵۳ء میں شیمل جنگ و جدال سے فارغ ہو کر قصبہ یدنیو میں آیا۔
اس جنگ میں روسیوں کے دعوے کے مطابق شیمل کو شکست ہوئی تھی، مگر شیمل اور اس کے فدائیوں کے ادعا کے مطابق روسیوں کو شکست اٹھانی پڑی تھی اور انہیں بھگا دیا گیا تھا۔
اس جنگ میں خود شیمل نے بھی کئی بار دشمن پر بندوق چلائی تھی جس کی اسے مشق نہ تھی۔
اور اگر فدائی نہ روکتے تو شمشیر کھینچ دشمن پر بھی جا ٹوٹتا اس کوشش میں اس کے دو فدائی وہیں کام آ گئے تھے۔
دوپہر کا وقت ہو گا کہ شیمل فتح مندانہ قصبہ یدنیو میں داخل ہوا۔ اس کے فدائی خوشی میں بندوقیں سر کر رہے تھے اور ان کی زبانوں پر کلمہ طیبہ تھا۔
بار بار لا الہ کی تکرار کرتے ہوئے وہ لوگ شیمل کے مکان تک آئے تھے قصبہ کے تمام آدمی شیمل کے استقبال کو گلی کوچوں میں جمع ہو گئے۔ بہت سے مکانوں کی چھت پر چڑھ

گئے۔ اور فتح کی علامت کے طور پر انہوں نے بھی بندوقیں چھوڑنا شروع کر دی تھیں۔
شمل ایک سفید عربی نسل گھوڑے پر سوار تھا۔
گھوڑے کے اردگرد کوئی سونے چاندی کے زیورات آویزاں نہ تھے بلکہ اس کی زین اور کاٹھی وغیرہ بالکل سادہ تھی۔
امام شمل نے بھورے رنگ کا چغہ پہن رکھا تھا جس کے اردگرد سیاہ سمور کا کام تھا۔
اس کے سر پر ایک لمبی اور اونچی کلاہ تھی جس کے اوپر کا حصہ چوڑا تھا۔ اور اس کے پیروں میں سبز رنگ کے جوتے تھے۔
اس کے جسم پر کوئی اعزازی جواہرات یا سونے کا زیور نہ تھا اور چہرے کے گرد سرخ داڑھی تھی۔ اور اس کی چھوٹی چھوٹی مگر باہر نکلی ہوئی آنکھیں ایسی نظر آ رہی تھیں جیسے پتھر کی ہوں۔
قصبہ کے ہزاروں آدمیوں کی اس پر آنکھیں لگی ہوئی تھیں۔
حاجی مراد کی بیویاں بھی دوسری عورتوں کے ساتھ دریچے میں آ گئیں تاکہ امام شمل کا جلوس دیکھیں۔ صرف حاجی مراد کی ماں ٹس سے مس نہ ہوئی۔
اس کی سیاہ اور بڑی آنکھوں میں غم و غصہ جھلک رہا تھا اور وہ ٹکٹکی باندھے آتش دان کی کجلاتی آگ کو دیکھ رہی تھی۔
اسی طرح حاجی مراد کا بڑا لڑکا یوسف گہرے گڑھے میں قید ہونے کی وجہ سے شمل کی سواری کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔
وہ شوروغل بندوقوں کی آواز اور نعرے تو سن رہا تھا۔
اس کا امنگ بھرا نوجوان دل تمام آسائشوں سے محروم کر دیا گیا تھا۔ نہ اسے تازہ ہوا نصیب تھی نہ سورج کی روشنی۔
یوسف صرف اپنے ساتھی دوسرے بدنصیب قیدیوں ہی کو دیکھ سکتا تھا۔
اندر سے اس کا دل کس قدر مچل رہا تھا۔ کاش اسے بھی دوسرے لوگوں کی طرح آزادی و تازہ ہوا نصیب ہوتی اور وہ بھی لالہ کے نعرے بلند کرتا۔
شمل جب اپنے مکان کے وسیع احاطے کے پھاٹک پر پہنچا تو وہاں لوگوں کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے۔
بہت سے لوگ عرض و معروضات لے کر آئے تھے اور بہت سے خود شمل کے بلائے ہوئے۔ جب وہ اندر داخل ہوا تو لوگ سینوں پر ہاتھ رکھ کر تکریم بجا لائے۔

یہاں امام کے بہت سے قریبی شناسا بھی موجود تھے مگر وہ سب کو یکساں طور پر بغیر کسی خاص التفات کے دیکھتا ہوا گزر گیا۔

آخر وہ مکان میں داخل ہوا۔

جسمانی و ذہنی طور پر تھکا ہوا تھا۔ ہر چند اعلان عام کے مطابق وہ جیت کر آیا تھا۔ مگر اسے احساس تھا کہ مہم کامیاب نہ رہی تھی اور یہ کہ روسیوں نے کئی تاتاری گاؤں جلا ڈالے تھے۔

ان گاؤں کے خانماں برباد لوگ روسی حد میں منتقل ہونے کا ارادہ کر رہے تھے۔

شمل کو ان تمام مسائل کا تدارک کرنا تھا۔ اسی لئے پریشان تھا۔

مگر سردست وہ صرف آرام اور ذرا گھریلو زندگی کا لطف لینے کی تمنا کر رہا تھا۔

سب سے زیادہ اسے اپنی سیاہ چشم و شوخ اٹھارہ سالہ بیوی امینہ کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ جو اب تک نظر نہ آئی تھی کیوں کہ دوسری عورتوں کے ساتھ وہ بھی سواری کا تماشہ دیکھ رہی تھی۔

مگر ابھی اسے آرام نصیب نہ تھا' کیونکہ کہ ایک تو نماز کا وقت آگیا تھا۔ امامت کرنا تھا۔

دوسرے جو لوگ اس سے ملنے آئے ہوئے تھے انہیں شرف ملاقات بخشنا تھا۔

ملاقات کے لئے سب سے پہلے آنے والوں میں سے جمال الدین تھا۔

جو امام شمل کا خسر ہوتا تھا۔ اس کی سفید نورانی داڑھی اور سرخ رنگ نمایاں چیز تھی۔

جمال الدین نے اپنے داماد شمل سے کہا۔

"اچھا اپنی مہم کا کچھ حال سناؤ"

شمل نے مختصرا تمام کیفیت اسے سنائی۔

شمل نے دریافت کیا۔

"آپ سنائیے' میری عدم موجودگی میں قصبہ میں کیا حالات رہے؟"

جمال الدین نے کہا۔

"تمہاری غیر حاضری میں یہاں بہت سے خاندانی جھگڑے ہوئے جن میں کچھ لوگ قتل بھی ہوئے تھے۔

پھر مویشیوں کی چوری' لوگوں کی عام نافرمانی' خلاف شرع حرکات یعنی تمباکو اور شراب

نوشی وغیرہ۔

جمال الدین نے کہا

"اچھا دیکھو۔ حاجی مراد نے اپنے آدمی بھی یہاں بھیجے تھے تاکہ اس کی فیملی کو اس کے پاس روسی سرحد میں پہنچائیں۔

لیکن ہمیں بروقت معلوم ہو گیا۔ چنانچہ ہم نے اس کی فیملی کو یہاں منتقل کر دیا اور حراست میں لے لیا۔ اب صرف تمہاری واپسی کا ہمیں انتظار تھا۔

دوسرے کمرے میں اور کئی لوگ جمع تھے۔

جمال الدین شمل سے بولا۔

"جاؤ پہلے جا کر ان آئے ہوئے آدمیوں سے مل آؤ۔"

شمل نے جلد جلد کھانا کھایا۔

یہ کھانا زیارت نے لا کر رکھا تھا وہ اس کی بڑی بیوی تھی۔ بدشکل و بد قطع۔ کھانے سے فارغ ہو کر شمل مہمانوں کے کمرے میں پہنچا۔

مہمانوں میں چھ معزز بوڑھے تھے۔ ان میں سے کئی کی داڑھیاں سفید تھیں اور بعض کی سرخ۔

شمل داخل ہوا تو سب نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ (اس میں شمل نے بھی شرکت کی) زیر لب کچھ آیات پڑھیں۔ آنکھیں بند کیں۔ پھر ختم دعا کے بعد سب نے مونہہ پر ہاتھ پھیرا۔

اس کے بعد سب بیٹھ گئے۔

شمل چونکہ امام تھا' اس نے ایک توشک پر جگہ لی پھر مختلف موضوعات پر یہ سب مل کر تبادلہ خیال کرنے لگے۔

مجرموں کے بارے میں شرعی فیصلے دئے گئے۔ دو چوروں کے ہاتھ قلم کرنے کی سزا طے کی گئی۔ ایک قاتل کے باب میں قصاص کا فیصلہ کیا گیا۔ تین کو جرم ثابت نہ ہونے کی وجہ سے بری کر دیا گیا۔

اس کے بعد وہ اصل موضوع کی طرف آئے یہ کہ شیشن (تاتاری) کو کس طرح روسیوں کا طرف دار ہونے سے روکا جائے۔

آخر اس کی روک تھام کے لئے جمال الدین نے مندرجہ ذیل اعلانیہ تیار کیا:

"تم سب پر خدا کا فضل و رحمت نازل ہو۔"

سنا جا رہا ہے کہ روس والے تمہیں چال بازیوں اور طمع کے ذریعہ اپنے میں ملانا چاہتے ہیں۔

چنانچہ ان کی ان تحریکات پر ایمان نہ لاؤ۔ ان کے مطیع ہرگز نہ بنو بلکہ جو کچھ سامنے آئے اسے استقامت سے برداشت کرو۔

اس کا صلہ اللہ تعالیٰ تمہیں آخرت میں بخشے گا۔ یہ دنیا تو فانی ہے۔ کیا تم بھول گئے کہ روسیوں نے تمہیں نہتا کرنے کے بعد کیا کیا تھا۔

اگر خدا نے تمہیں ۱۸۴۰ء میں سمجھ سے معرا کر دیا تھا تو اب تو ہوش میں آؤ۔ اگر تم اب بھی ہوش میں نہ آئے تو تمہاری بیویاں بے عزت کر دی جائیں گی، اور پاجاموں سے محروم کی جائیں گی۔

مستقبل کا اندازہ ماضی سے لگاؤ۔

روسیوں کی دشمنی میں مرجانا ان ملحدوں کے ساتھ زندہ رہنے سے بہتر ہے۔ ذرا صبر سے کام لو۔

میں جلد قرآن اور شمشیر لے کر آؤں گا اور تمہیں دشمنوں کے خلاف صف آرا کروں گا۔ لیکن سردست میں تم کو سختی سے تلقین کرتا ہوں کہ ہرگز ہرگز روسیوں کے تابع نہ ہونا۔"

جمال الدین نے یہ اعلانیہ ختم کر کے سب کی طرف دیکھا۔

شمل نے اسے پسند کیا چنانچہ اس پر اپنے دستخط کئے اور ڈھنڈورے کے لئے اسے قصبہ اور دیہاتوں میں روانہ کر دیا۔

اس سے فارغ ہونے کے بعد اب وہ حاجی مراد کے مسئلہ کی طرف آئے کیونکہ شمل کے لئے یہ مسئلہ اہم ترین تھا۔

بظاہر وہ اسے اہمیت نہیں دیتا تھا۔ مگر دل میں سوچتا تھا کہ اگر حاجی مراد جیسا جیوٹ بہادر اور تیز و طرار شخص اس کے ساتھ ہوتا تو جو آج کل تاتاری آبادیوں پر بیت رہی تھی اس کی نوبت نہ آتی۔

اس لئے مناسب یہی ہے کہ حاجی مراد سے مصالحت کر لی جائے اور اس کی خدمات سے فائدہ اٹھایا جائے۔

لیکن یہ ممکن نہ رہا تھا۔ چنانچہ یہی کیا جائے کہ وہ روسیوں کے بھی کام نہ آنے پائے۔ اس کی ایک یہی صورت ممکن تھی کہ حاجی مراد کو کسی زبردست ترغیب سے یہاں

بلایا جائے اور قتل کر دیا جائے۔

اگر وہ نہ آئے تو مفلس ہی میں کسی آدمی کو مقرر کر دیا جائے جو وہیں اسے مار ڈالے اور اگر یہاں آگیا تو اسے یہیں ختم کر دیا جائے۔

یہ شیمل کا منصوبہ تھا۔

اس کو یہاں بلانے کی ترغیب کا ذریعہ اس کی فیملی تھی۔ بالخصوص اس کا لڑکا بہت اچھا ذریعہ ہو سکتا تھا۔

جس کے متعلق شیمل کو معلوم تھا کہ حاجی مراد اسے بے حد چاہتا ہے۔ بس تو حاجی مراد کو واپس بلانے میں اس کے بیٹے ہی کو آلہ کار بنایا جائے۔

اس غور و خوض کے بعد شیمل نے آنکھیں بند کر لیں۔

حاضرین سمجھے کہ وہ غیبی آواز سن رہا ہے۔

آخر چند منٹ بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور بولا۔

"حاجی مراد کے بڑے لڑکے کو میرے پاس لاؤ۔"

جمال الدین نے جواب دیا۔

"وہ حاضر ہے۔"

اسکے بعد ایک نوجوان جس کا جسم مصائب سے خشک ہو گیا تھا۔ رنگ زرد ہو رہا تھا۔ کپڑوں سے بو آ رہی تھی مگر پھر بھی اس کے چہرے سے وجاہت نمایاں تھی۔ اور سیاہ آنکھوں میں ویسی ہی آگ روشن تھی جیسی حاجی مراد اور اس کی والدہ کی آنکھوں میں نظر آتی تھی۔

یوسف (حاجی مراد کا یہ لڑکا) اپنے باپ کی طرح شیمل کا مخالف نہ تھا۔ پچھلے واقعات کا اسے کچھ علم نہیں تھا اور اگر کسی قدر تھا بھی تو وہ سمجھنے سے قاصر رہ گیا تھا کہ اس کا والد شیمل کا اس قدر دشمن کیوں بن گیا تھا۔

وہ صرف اس چیز کا خواہاں تھا کہ پہلے کی طرح آرام سے زندگی گزار دے۔ جس طرح کچھ عرصہ پیشتر نائب کے بیٹے کی حیثیت سے خنزق میں اپنے والد کے زیر سایہ گزار چکا تھا۔

اپنے پدر کے برعکس یوسف اور کوہستانی باشندوں کی طرح شیمل کی عزت کرتا تھا۔ چنانچہ اس وقت بھی امام کے متعلق جذبہ احترام لئے شیمل کے کمرے میں داخل ہوا تھا۔

جونہی یوسف نے کمرے میں قدم رکھا۔ شیمل نے اپنی نیم وا آنکھیں اس کی طرف

متوجہ کر دیں۔

یوسف نے بڑھ کر شمل کی دست بوسی کی۔

شمل نے اس سے دریافت کیا۔

"تو حاجی مراد کا لڑکا ہے؟"

یوسف نے جواب دیا۔

"جی ہاں امام۔"

شمل بولا۔

"تجھے معلوم ہے تیرے باپ نے کیا کیا ہے؟"

یوسف نے کہا۔

"میں اس پر شرمسار ہوں امام۔"

شمل نے پوچھا۔

"کیا تو لکھ پڑھ سکتا ہے؟"

یوسف نے جواب دیا۔

"میں عربی کا طالب علم رہ چکا ہوں۔"

شمل نے بدلے تیوروں سے کہا۔

"اچھا تو اپنے والد کو بدین مضمون ایک خط لکھ کر کہ اگر وہ میرے پاس رمضان سے پہلے آ جائے گا تو میں اسے معاف کر دوں گا۔"

اور اس سے پہلے جیسے اچھے تعلقات قائم کر لوں گا۔ اور اگر میرے پاس نہ آیا بلکہ روسیوں ہی میں ملا رہا تو اس کو آگاہ کر دے کہ میں اس کی والدہ۔ بیویوں اور دوسرے کنبہ والوں کو ایک دوسرے سے جدا کر کے کہیں سے کہیں پہنچا دوں گا اور یوسف تجھے قتل کر دوں گا۔ یہی لکھ بھیج اسے

یوسف بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ آخر سر جھکایا جس کا مقصد یہ تھا کہ حکم کی تعمیل کی جائے گی۔

شمل نے کہا۔

"اسی وقت یہ سب کچھ لکھ کر مجھے دے دے۔"

اور کئی سیکنڈ تک یوسف کو غور سے دیکھتا رہا۔

پھر بولا۔

"اپنے باپ کو یہ بھی لکھ دے کہ ممکن ہے تیرے لڑکے پر رحم کھا کر اسے قتل نہ کروں مگر اس کی آنکھیں نکلوا دوں گا۔ غداروں کو میں یہی سزا دیتا ہوں۔"

یوسف چلا گیا' جب تک وہ شمل کے سامنے رہا صبر و سکون کا مظاہرہ کرتا رہا مگر باہر نکلتے ہی اس نے ایک شخص کا خنجر جھپٹ لیا۔

اور قریب تھا کہ خودکشی کر لیتا لیکن لوگوں نے اس کے ہاتھ سے خنجر چھین لیا اور اسے واپس لے جا کر غار میں بند کر دیا۔

اس روز شام کو مغرب کی نماز ادا کرنے کے بعد شمل نے لباس تبدیل کیا اور اپنی نوجوان بیوی امینہ کے پاس پہنچا لیکن وہ وہاں موجود نہ تھی۔ دوسری عورتوں کے پاس گئی ہوئی تھی۔

شمل دروازے کے پیچھے چھپ کر اس کا انتظار کرنے لگا لیکن امینہ اس سے خفا تھی کیونکہ شمل نے کچھ ریشمی کپڑا اپنی بڑی بیوی زیارت کو دے دیا تھا۔

امینہ نے اسے اپنے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا اور یہ بھی محسوس کر لیا تھا کہ وہ اسے تلاش کر رہا ہے۔

اسی لئے وہ قصداً اسے ستانے کے لئے اس کے پاس نہیں آئی تھی' بلکہ زیارت کے کمرے کے قریب کھڑی ہوئی بہت دیر تک ہنستی رہی اور دور ہی سے شمل کو ستاتی رہی۔

اس سے مایوس ہو کر آخر شمل واپس اپنے کمرے میں آ گیا کچھ دیر کام کرتا رہا یہاں تک کہ عشاء کی نماز کا وقت ہو گیا۔

میجر پتروف کے ہاں رہتے ہوئے حاجی مراد کو ایک ہفتہ گزر گیا۔ یعنی اس قلعہ میں آئے ہوئے اسے سات' آٹھ دن ہو گئے تھے۔

اس دوران میں ماریہ کئی بار حاجی مراد کے وفادار رفیق حنیف سے لڑ چکی تھی (حاجی مراد اپنے ہمراہ صرف اپنے دو رفیقوں کو لایا تھا۔ حنیف اور الدر ہی اس کے ساتھ تھے۔) ماریہ نے حنیف کو لڑ جھگڑ کر باورچی خانے سے نکال دیا۔ اس پر حنیف بھی بہت بھنا رہا تھا۔ لیکن ماریہ کے دل میں حاجی مراد کے لئے خاص عزت و ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔

اب اگرچہ وہ حاجی مراد کو کھانا نہیں کھلاتی تھی بلکہ یہ ڈیوٹی اس نے الدر کے سپرد کر دی تھی مگر موقع ملتے ہی وہ اسے دیکھنے اور اس کا کچھ کام کرنے آ جاتی تھی۔

حاجی مراد کی فیملی کو یہاں لائے جانے کے معاملے میں بھی وہ گہری دلچسپی لے رہی تھی۔

اس کی بیویوں اور بچوں کے باب میں بھی اسی طرح ہمدردی کا اظہار کرتی اس کے علاوہ جہاں کوئی جاسوس حاجی مراد کی فیملی کے متعلق کوئی خبر لاتا تو وہ سب سے پہلے ماریہ ہی لپک کر نتیجے کے بارے میں دریافت کرتی تھی۔

اس ایک ہفتہ کے درمیان میں بٹلر کا بھی حاجی مراد سے کافی دوستانہ ہو گیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے پاس آتے جاتے رہتے تھے۔ بعض وقت کسی مترجم کے ذریعہ بات چیت کرتے کبھی خود ہی اشاروں اور کنایوں سے ایک دوسرے کو اپنا مفہوم سمجھانے لگتے۔

حاجی مراد بھی بٹلر کو بہت پسند کرنے لگا تھا۔ اسی طرح جب بٹلر حاجی مراد کے کمرے میں داخل ہوتا تو الدر بھی تبسم سے اس کا خیرمقدم کرتا۔ اور ہر طرح اس کی خاطر مدارات میں لگ جاتا۔

بٹلر نے حنیف سے بھی تعلقات بڑھا لئے تھے۔

حاجی مراد کے رضاعی بھائی حنیف کو بہت سے کوہستانی گانے آتے تھے۔ بٹلر کی تواضع کے سلسلہ میں حاجی مراد حنیف سے یہ گیت گانے کو کہتا تو وہ لہک لہک کر گانے لگتا تھا۔ ان گیتوں میں ایک گیت تو بٹلر کو بہت ہی پسند تھا۔ وہ مترجم سے اس کا ترجمہ بڑے

شوق سے سنتا تھا۔ وہ گیت یہ تھا:

میری قبر کی مٹی خشک ہو جائے گی
میری اماں تم مجھے بھول جاؤ گی۔
اور میری تربت پر سبزہ اگ آئے گا۔
میرے ابا تم بھی بھول جاؤ گے۔
جب تیری سیاہ آنکھوں میں اشک خشک ہو جائیں گے۔
تو اے میری ہمشیرہ تو بھی میرے غم کو بھول جائے گی۔
لیکن میرا بھائی (حاجی مراد) کبھی نہیں بھولے گا۔
اس نے ہمیشہ مجھ پر مہربانی کی۔
میرا چھوٹا بھائی کبھی افسوس نہیں کرے گا۔
اور میرے ساتھ پیوند زمین ہو جائے گا۔
اے موت تو کس قدر غرور کے ساتھ میرے اعمال کے نتیجے میں آئے گی۔
لیکن تو میری لونڈی ہے۔
اور اے سیاہ زمین تجھے جنگلی گھوڑے روندتے ہیں۔
تو ہی میری قبر کو ڈھانک دے گی۔
اے موت تو اگرچہ سرد دل ہے لیکن میں تیرا آقا ہوں۔
میرا جسم تو زمین کا پیوند ہو جائے گا مگر میری روح آسماں کی طرف پرواز کر جائے گی۔

اس گیت کو حاجی مراد ہمیشہ آنکھیں بند کر کے سنا کرتا تھا۔ اور جب یہ ختم ہو جاتا تو اس کے مونہہ سے اس کے متعلق تحسین کے کلمات نکلتے تھے۔

حاجی مراد کے یہاں آنے سے اور کوہستانی گانوں کو سنتے سنتے بٹلر کے دل میں کوہستانی زندگی نے گھر کر لیا تھا۔

وہ تاتاری لباس پہن لیتا اور تصور کرنے لگتا گویا تاتاری ہو گیا ہے' اور دوسرے کوہستانیوں کے ساتھ زندگی بسر کر رہا ہے۔

حاجی مراد کی روانگی کے دن میجر پتروف نے دعوت کی اس میں دوسرے افسروں کو بھی

مدعو کیا گیا تھا۔
ان میں سے کچھ تو میز کے پاس ماریہ کے قریب بیٹھے تھے ماریہ چائے وغیرہ کے انتظام
میں مصروف تھی چند دوسری میز پر تھے جہاں شراب رکھی ہوئی تھی۔
آخر حاجی مراد سفر کا لباس پہنے ہوئے اپنے قدرے لنگ کے ساتھ داخل ہوا۔
اس کو دیکھ کر سب اٹھ کھڑے ہوئے اور اس سے مصافحہ کیا۔
میجر نے اسے ممتاز جگہ پر بٹھایا لیکن حاجی مراد اس کا شکریہ ادا کر کے کھڑکی کے
قریب ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔
اس کے آ جانے سے جو خاموشی سی طاری ہو گئی تھی اس سے وہ پریشان نہیں ہوا۔
ہر ایک کو دیکھتا رہا اور عدم دلچسپی سے چائے پھل وغیرہ کی طرف نظر ڈالی۔
پژوخی ایک زندہ افسر تھا۔ مسکرا کر حاجی مراد سے (مترجم کے ذریعہ) بولا
"کیسے آپ کو طفلس پسند آیا تھا؟"
حاجی مراد نے جواب دیا۔
"الیا (ہاں)
پژوخی نے پوچھا۔
"وہاں آپ کو سب سے زیادہ کیا چیز پسند آئی؟"
حاجی مراد نے کہا۔
"وہاں کا تھیٹر"
پژوخی نے پوچھا۔
اور کمانڈر انچیف کی محفل رقص بھی پسند آئی ہو گی؟"
اس سوال کے جواب میں حاجی مراد نے پیشانی پر ذرا بل ڈالے' پھر بولا
حاجی مراد نے ماریہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"ہر قوم اپنے چند رسم و رواج رکھتی ہے۔ ہمارے ہاں عورتیں ایسا لباس نہیں
استعمال کرتیں۔"
ماریہ مترجم سے بولی۔
"اچھا اسے میرا لباس پسند نہیں؟"
حاجی مراد نے مسکرا کر کہا۔
"ہمارے ہاں ایک کہاوت مشہور ہے۔ کتے نے اپنے حصے کا گوشت گدھے کو دیا اور

گدھے نے اپنے سامنے کی گھاس کتے کے سامنے رکھ دی۔ دونوں بھوکے رہ گئے۔"
گفتگو نے طول نہیں پکڑا کیونکہ کچھ افسر کھانے پینے میں مصروف ہو گئے۔
حاجی مراد کو بھی چائے کی پیالی پیش کی جسے اس نے قبول کر کے اپنے سامنے رکھ لیا۔
ماریہ نے اس کی طرف پلیٹ بڑھا کر کہا۔
"کیا آپ مکھن اور بسکٹ نہیں لیں گے؟"
حاجی مراد نے ادب سے سر جھکایا۔
بٹلر نے حاجی مراد کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔
اب جدائی کی گھڑی قریب آ رہی ہے۔ اچھا آئندہ کب ملاقات ہو گی؟"
حاجی مراد نے ٹوٹی پھوٹی روسی زبان میں کہا۔
"دیکھئے۔ اچھا خدا حافظ۔ کناخ بلک۔ مضبوط کناخ آئدا"
اور اپنے سفر کی سمت سر سے اشارہ کیا۔
اس دوران میں حاجی مراد جاں نثار وجیہہ الدر اپنے آقا کی سفید ریشمی چادر اور تلوار لے کر حاضر ہوا۔
حاجی مراد نے چادر ہاتھ پر پھیلا کر مترجم سے کچھ کہا۔ پھر وہ چادر ماریہ کو پیش کی۔
مترجم نے حاجی مراد کی ترجمانی کرتے ہوئے ماریہ سے کہا۔
"یہ کہتا ہے کہ چادر چونکہ آپ کو پسند آئی ہے' اس لئے پیش کرتا ہوں۔"
ماریہ نے قدرے حیا سے کہا۔
"اچھا ـــــ مگر کیوں پیش کر رہا ہے۔"
حاجی مراد بولا۔
"ویسے ہی یادگار کے طور پر۔"
ماریہ نے مسکرا کر کہا۔ پھر بولی۔
"بہت بہت شکریہ۔
"خدا کرے تم اپنے لڑکے کو رہائی دلانے میں کامیاب ہو۔ الن یکشی"
حاجی مراد نے اس کی طرف دیکھا اور سر کی جنبش سے شکریہ ادا کیا۔
اس کے بعد بڑھ کر تلوار ماریہ کے شوہر میجر پتروف کو پیش کی۔
میجر نے اسے قبول کر لیا اور مترجم سے بولا۔
"اس سے کہو کہ میرا گھوڑا قبول کرے۔ میرے پاس کچھ اور دینے کو نہیں ہے"

حاجی مراد نے سر کی جنبش سے انکار کیا اور مترجم سے بولا۔
"مجھے کچھ نہیں چاہئے۔"
اس کے بعد اس نے دور پہاڑی حصار کی طرف اشارہ کیا پھر اپنے دل پر ہاتھ رکھا۔
اس سین کے بعد وہ باہر نکل آیا۔
اس کے پیچھے پیچھے تمام گھر والے آ گئے۔ اور دور تک اس کی مشایعت میں چلے گئے۔
اندر جو افسر رہ گئے تھے۔ انہوں نے تلوار کو نیام سے نکال کر اس کی آب کا معائنہ
کیا اور اس کی خوبی کے معترف ہوئے۔
بٹلر دور تک حاجی مراد کے ساتھ چلا آیا۔
لیکن دفعتہ" ایک حیرت ناک واقعہ پیش آگیا جس میں حاجی مراد کی جان چلی جاتی اگر
وہ انتہائی چستی اور چالاکی سے کام نہ لیتا۔ ہوا یہ کہ روسی مقبوضات کی بستی کناخ اور تاش
کچو کے باشندے جو روسیوں کے دوست تھے اور حاجی مراد کا بھی احترام کرتے تھے "
(جب سے حاجی مراد اس قلعہ میں آیا تھا) اس کی زیارت کو آتے رہتے تھے۔
تین روز قبل بستی والوں نے حاجی مراد کے پاس عاجزانہ پیغام بھیجا تھا، کہ جمعہ کو بستی
ہی کی مسجد میں آکر نماز ادا کرے اور انہیں چند منٹ کے لئے شرف تواضع بخشے۔
مگر تاش کچو کے بڑے زمیندار حاجی مراد سے نفرت کرتے تھے کیونکہ ان میں اور حاجی
مراد میں پہلے سے عداوت چلی آ رہی تھی۔
انہیں معلوم جو ہوا کہ بستی والوں نے حاجی مراد کو قصبہ میں مدعو کیا ہے تو سخت
برافروختہ ہوئے۔
اور کہنے لگے۔
کہ حاجی مراد کو جامع مسجد میں قدم نہیں رکھنے دیں گے۔ اس پر بستی والوں اور
زمینداروں میں تلوار چل گئی۔
آخر روسی افسروں نے بیچ بچاؤ کر دیا اور حاجی مراد کو آگاہ کیا کہ بستی میں نہ آئے۔
چنانچہ حاجی مراد نہیں گیا۔
غرض ہر شخص مطمئن ہو گیا کہ معاملہ رفع دفع ہوا۔
لیکن قلعہ سے حاجی مراد کی عین روانگی کے وقت جب کہ وہ اپنے گھوڑوں کی طرف
جا رہا تھا تو ارسلان خان زمیندار جس کی ملاقات بٹلر اور میجر پتروف سے تھی میجر سے ملنے
وہاں آیا۔

مگر جونہی اس کی نظر حاجی مراد پر پڑی تو اس نے پستول نکال لیا۔ اور قریب تھا کہ فائر کر دے کہ حاجی مراد باوجود لنگ کے چیتے کی طرح جھپٹا۔ ارسلان خان کا نشانہ خطا کر گیا۔
حاجی مراد نے جھپٹ کر اس کے گھوڑے کی ایک ہاتھ سے باگ پکڑ لی اور دوسرے ہاتھ سے خنجر نکال کر تاتاری میں ارسلان خان سے گرج کر کچھ کہا۔
بٹلر اور الدر بھی دوڑ کر آ گئے انہوں نے ارسلان خاں اور اس کے آدمیوں کو پکڑ لیا۔

میجر نے بھی چیخ پکار سنی اور وہ بھی جلدی سے آ پہنچا۔
میجر نے ارسلان خان سے کہا۔
"ارسلان خاں یہ تمہاری کیا حرکت تھی۔ اور عین میرے مکان کے نزدیک تم دونوں میدان جنگ میں نہیں ہو بلکہ میرے مکان کر قریب ہو۔
ارسلان خاں ایک پستہ قامت انسان تھا جس کی کالی موچھیں تھیں گھوڑے پر سے اتر پڑا۔ اس کا رنگ زرد ہو گیا تھا اور وہ کپکپا رہا تھا۔
حاجی مراد کی طرف تیور بدل کر دیکھنے لگا۔ اس کے بعد میجر کے ساتھ اس کے مکان میں آ گیا۔ حاجی مراد نے اطمینان کا سانس لیا اور مسکراتا ہوا اپنے گھوڑوں کے پاس آ گیا۔
بٹلر نے حاجی مراد سے دریافت کیا۔
"وہ تمہیں کیوں مار ڈالنا چاہتا تھا؟"
مترجم نے حاجی مراد کی ترجمانی میں کہا۔
"ہمارے ہاں کا یہ طریقہ ہے کہ ارسلان خاں حاجی مراد کے ہاتھ سے مقتول اپنے ایک رشتہ دار کا بدلہ لے۔
بٹلر نے پوچھا۔
"اچھا فرض کرو کہ اب ارسلان حاجی مراد کو سڑک پر جا پکڑے؟"
اس کے جواب میں حاجی مراد مسکرایا۔
حاجی مراد بولا۔
"اگر مشیت ایزدی یہی ہے تو وہ مجھے مار سکتا ہے۔"
حاجی مراد نے اپنی مشایعت میں آنے والے سب سفید فام لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"اچھا خدا حافظ۔"

پھر ماریہ سے بولا۔
"خدا حافظ میری بچی۔ میں تیرا بڑا ممنون ہوں۔
ماریہ نے کہا۔
"خدا تمہیں اپنی فیملی کو رہائی دلانے میں کامیاب کرے۔"
حاجی مراد اس کے کچھ الفاظ سمجھ سکا' کچھ نہ سمجھ سکا مگر اتنا اندازہ ضرور لگایا کہ اس کی ہمدردی میں وہ کچھ کہہ رہی ہے۔
بٹلر نے حاجی مراد سے کہا۔
"دیکھو اپنے بھائی کو نہ بھول جانا۔"
حاجی مراد نے کہا۔
"تو میرا گہرا دوست ہے' اور تجھے کبھی نہیں بھولوں گا۔"
اس کے بعد سپاہیانہ چستی سے گھوڑے پر سوار ہو گیا' اور اپنے خنجر و شمشیر کو قاعدے سے جما لیا۔ پھر سپاہیانہ آن بان سے روانہ ہوا۔ اس کے عقب میں حنیف اور الدر بھی سوار ہو کر روانہ ہوئے۔
اس کے روانہ ہونے کے بعد افسر آپس میں اس کے متعلق گفتگو کرنے لگے۔
ایک بولا۔
بڑا جری انسان ہے۔ ارسلان خاں پر شیر کی طرح جھپٹا تھا اور اس وقت اس کے چہرے کے نقش و نگار بالکل بدل گئے تھے۔
پڑوخی نے کہا۔
"مگر وہ اپنے حریفوں کی چالاکیوں کا شکار ہو جائے گا کیونکہ ان کے لئے وہ بہت خطرناک ہے۔"
ماریہ بولی
"افسوس ہے کہ روسیوں میں اس جیسے جیوٹ انسان نہیں ہیں۔"
اس نے پھر کہا۔
"حاجی مراد ہمارے مکان میں ایک ہفتہ تک رہا مگر میں نے سوائے خوبیوں کے اس کے اندر ایک برائی بھی نہیں دیکھی۔ وہ خوش خلق' بہادر اور دانش مند اور منصف فراج انسان ہے۔"
ایک افسر نے ماریہ سے پوچھا۔

"تم نے اس میں یہ خوبیاں کس طرح ٹٹول لیں۔"
ماریہ نے جواب دیا
"اس سے بحث نہیں۔ مگر یہ حقیقت ہے۔"
میجر نے کہا۔ جو ابھی کمرے میں داخل ہوا تھا۔
"یہ مرعوب ہو گئی ہے اس سے۔"
ماریہ نے میجر سے کہا۔
"مرعوب سہی، تمہیں اس سے کیا۔ کسی اچھے آدمی کی برائی کرنے سے کیا فائدہ۔ حالانکہ وہ تاتار ہے۔ پھر بھی بہت ہی بھلا انسان ہے۔"
بٹلر نے کہا۔
"ٹھیک کہہ رہی ہو ماریہ اور تم اس کی حمایت لینے میں حق بجانب ہو۔"

یہ روسی قلعہ (جس سے حاجی مراد رخصت ہوا تھا) تاتاری سرحد پر آخری تھا اس کے حالات حسب معمول چل رہے تھے۔ صرف دو معمولی سے واقعات گزرے جن میں فوجی دستے کو نقل و حرکت کرنی پڑی تھی۔

ایک دفعہ تو کوہستانی لوگوں نے یلغار کیا تھا جسے فوج نے بھگا دیا اور دوسری بار ان کے یلغار میں ایک روسی قزاق مارا گیا تھا اور وہ آٹھ گھوڑوں کو لے جانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

تاتاری بستیوں پر اس ایک دھاوے کے بعد (جس میں سیدو کا خوش رو لڑکا مارا گیا تھا) کوئی حملہ نہیں کیا گیا۔

لیکن بائیں بازو پر نئے کمانڈر بریان ٹسکی کے تقرر کے بعد ایک مہم کا منصوبہ تیار کیا گیا تھا۔

بریان ٹسکی پرنس درنوخ کا پرانا دوست تھا اور پہلے کبادا رجمینٹ کا افسر اعلیٰ تھا۔

بائیں بازو کا کمانڈر مقرر ہوتے ہی اسے زار کے حکم کی تعمیل میں فوجی کارروائی کرنی پڑی۔ چنانچہ ایک فوجی دستے نے وردن زیک سے ہٹ کر قلعہ سے آگے کورن کے قریب کیمپ ڈال دیا۔

یہاں پہلے سے تھوڑی سی فوج موجود تھی جو جنگل صاف کرنے میں لگی ہوئی تھی۔

نوجوان پرنس درنوخ (جس سے حاجی مراد سب سے پہلے آکر ملا تھا اور جو بوڑھے کمانڈر انچیف درنوخ کا لڑکا تھا) یہاں ایک شاندار خیمہ میں مقیم تھا۔

اس کے پاس کبھی کبھی اس کی حسین ماریہ قلعہ سے آکر رہنے لگتی تھی بریان ٹسکی سے ماریہ کے تعلقات ڈھکے چھپے نہیں تھے۔

بہت سے افسر جن کا تعلق اعلیٰ طبقہ سے تھا اور کئی سپاہی ماریہ کو برا کہنے لگے تھے کہ وہ خیمہ میں آکر رات کیوں گزارتی ہے۔

کوہستانی جب کبھی حملہ کرتے تو اپنے ساتھ توپیں ضرور لاتے جن سے کیمپ میں گولہ باری کیا کرتے تھے۔

ان کے گولے اکثر و بیشتر خطا جاتے تھے۔ اسی وجہ سے ان کی گولہ باری کے خلاف

کوئی خاص اہتمام نہیں کیا گیا تھا۔ لیکن اب ماریہ کی خاطر سپاہیوں کو رات کے وقت گھات میں بیٹھنا پڑتا تھا کہ کہیں کوہستانی اچانک گولے نہ برسانے لگیں۔

محض ایک عورت کی خاطر کہ وہ گولوں سے ڈر نہ جائے روسی سپاہیوں کو گھات میں بیٹھنا سخت ناگوار معلوم ہونے لگا تھا۔

اسی بنا پر سپاہی اور کم درجے کے آفیسر جل کر ماریہ کو گالیاں دینے لگے تھے۔

بٹلر بھی کورن کیمپ میں اپنے پرانے چند آفیسر سے ملنے قلعہ سے منتقل ہو کر آیا ہوا تھا۔

یہاں آنے کے ابتدائی چند روز تو بڑے ہنسی خوشی گزارے۔

وہ بریان ٹسکی ہی کے خیمہ میں فروکش ہوا تھا۔ جہاں اس کی اپنے چند دیرینہ رفقاء سے بھی ملاقات ہوئی۔ انہوں نے بٹلر کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔

بٹلر پرنس درنوخ (جس سے وہ معمولی سا واقف تھا اور اس کے ساتھ ایک رجمنٹ میں رہ چکا تھا) سے بھی جا کر ملا۔ درنوخ نے اس سے خندہ پیشانی سے ملاقات کی اور جنرل کو زوسکی کی وداعی پارٹی میں اسے بھی مدعو کیا۔

بڑی شاندار پارٹی تھی جس میں اعلیٰ قسم کے ڈنر کا اہتمام کیا گیا تھا اور نفیس خیمے نصب کئے گئے تھے۔

ایک طویل میز پر کھانا چنا گیا جس کے دونوں طرف آفیسر بیٹھے ہوئے تھے اور رخصت ہونے والے جنرل کو زوسکی کی نشست درمیان میں تھی۔

بٹلر نے پولتروسکی کے قریب جگہ لی اور دونوں خوش گپیوں میں مصروف ہو گئے۔ دور چلتا رہا' کھانا اڑتا رہا۔

پولتروسکی نے آہستہ سے بٹلر سے کہا۔

"یہ اپنا کوزوسکی خود کو بدنام کر لے گا۔"

بٹلر نے پوچھا۔

"کیوں؟"

پولتروسکی نے کہا۔

"وہ ابھی تقریر کرنے والا ہے۔ اور اس کی تقریر بڑی ہی مہمل ہوتی ہے۔"

"پھر یہاں ایک عورت بھی موجود ہے اور اعلیٰ افسر بھی۔"

دوسرے افسر بھی بولے۔

"ہمیں بھی اس پر غصہ آتا ہے۔"

آخر تقاریر کا لمحہ آ گیا۔

اور جنرل بریان ٹسکی نے اپنی عینک درست کرتے ہوئے مختصرا کوزوسکی کو خطاب کیا۔

اس کے بعد بریان ٹسکی کے ایڈریس کے جواب میں کوزوسکی اٹھا اور میز کو بجانے کے بعد بولا۔

"حسب الحکم شہنشاہ زار، میں آپ لوگوں سے رخصت ہو رہا ہوں۔ (یعنی میرا تبادلہ ہو گیا ہے) لیکن آپ یہی سمجھنا کہ جیسے میں آپ ہی لوگوں کے درمیان میں ہوں۔

یہ کہاوت تو آپ جانتے ہی ہیں کہ اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا۔ چنانچہ مجھے جس قدر انعام و اکرام ملے۔ جو جو مجھ سے کارہائے نمایاں ظہور پذیر ہوئے جس قدر شہنشاہ زار نے میری عزت افزائی فرمائی۔ میری تمام پوزیشن اور یہ نیک نامی غرض ہر چیز آپ حضرات کے تعاون ہی کا نتیجہ ہے۔

"اس باب میں آپ صاحبان کا میں بے حد زیر بار احسان ہوں۔"

اس کے بعد وہ ذرا گلوگیر ہو گیا اور اس کے جھری زدہ چہرے پر ایک دو قطرات اشک ڈھل آئے۔"

"بہرحال میں تہ دل سے آپ لوگوں کا ممنون ہوں۔"

اس کے بعد اس نے ایک ایک افسر کو گلے لگایا۔ شہزادی ماریہ نے اپنے مونہہ پر رومال رکھ لیا اور اس کا شوہر پرنس درنوخ آنکھیں ٹمٹمانے لگا۔

بہت سے افسروں کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے حالانکہ وہ کوزوسکی سے اچھی طرح واقف نہ تھے۔ خود کوزوسکی کے اشک رواں تھے۔

اس کے بعد سب نے اس کی صحت کے جام نوش کیے۔ اس قدر کثرت سے شراب پی گئی کہ سپاہی اور افسر جب اٹھے تو نشہ میں چور تھے۔

موسم بڑا خوش گوار ہو رہا تھا۔ صاف شفاف آسمان میں سورج چمک رہا تھا اور ہر طرف سکوت طاری تھا۔

بٹلر بھی بہت پر مسرت موڈ میں پولتروسکی کے پاس پہنچا۔

پھر چند آفیسر مل کر تاش بازی میں مصروف ہو گئے اور بڑی بازیاں لگنا شروع ہوئیں۔

بٹلر جوا کھیلنے سے توبہ کر چکا تھا۔ کیونکہ اسی عادت کی بدولت وہ پہلے دیوالیہ ہوا تھا اور زیادہ ترقی نہ کر سکا تھا چنانچہ اپنے جیب سنبھالے ہوئے کئی بار وہ باہر نکل نکل گیا مگر آخر

کھیلنے کی طمع پر غالب نہ آسکا۔

اس کے بعد جو اس نے ہارنا شروع کیا تو شمار ہی نہ رکھ سکا کہ کس قدر ہارا تھا۔ وہ شاید کھیلتا ہی رہتا۔ مگر پاس کے ایک افسر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

اب ہر شخص اسے بہ نظر ترحم دیکھ رہا تھا۔ یہ خود بٹلر نے بھی محسوس کیا۔ اس کے بعد اسے پچھتاوے نے آلیا کہ اس نے یہ حماقت کیوں کی، چلا کیوں نہ گیا۔

آخر تھوڑی دیر بعد اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے ساتھیوں سے رخصت ہو کر مکان پر چلا آیا۔ اس کے بعد جو پڑ کر سویا تو اٹھارہ گھنٹے کی خبر لایا۔

ہارا ہوا جواری عموماً خوب سویا کرتا ہے۔ ماریہ سے کچھ بہانہ کر کے اس نے تھوڑی سی رقم ادھار لی تھی جب وہ ہار کر واپس لوٹا تھا تو ماریہ نے اندازہ لگا لیا تھا کہ لٹ لٹا کر آیا ہے۔

دوسرے روز دوپہر کو جب وہ بیدار ہوا تو اسے اپنی حالت کا احساس ہوا۔

جوئے سے وہ پہلے تائب ہو چکا تھا۔ مگر کل شب کو وہ ساڑھے چار سو روپے کا مقروض ہو گیا تھا۔ یہ روپیہ کہاں سے ادا کرتا، پہلے تو یہی سوچا کہ مردے پر جہاں ایک من مٹی وہاں سوا من اور سہی، پھر جا کر کھیلے مگر رک گیا۔

آخر اس نے اپنے بھائی کو خط لکھا جس میں اپنی قمار بازی کا اعتراف کیا اور اسے عاجزانہ لکھا کہ مشترکہ جائداد پر آخری بار پانچ سو ربل اور قرض دے دے۔

اس کے بعد ایک چٹھی اس نے اپنی رشتہ دار ایک لڑکی کو بھی پانچ سو ربل قرض دینے کے متعلق تحریر کی۔

اس کے بعد میجر کے پاس آیا۔ اس نے ماریہ پر ٹالا۔ غرض سب طرف سے مایوس ہو کر صرف اپنے بھائی کی طرف سے امداد آنے کا انتظار کرنے لگا۔

شیچنیا میں بھی مراد بر آری سے مایوس ہو کر حاجی مراد نے مفلس کا رخ کیا۔ اور وہاں پہنچ کر روزانہ پرنس درنوخ کے در دولت پر حاضری دینے لگا۔

روزانہ ہی وہ اس سے التجا کرتا کہ شیمل کے پاس روسیوں کے پکڑے ہوئے قیدی روانہ کر کے ان کا تبادلہ اس کی فیملی سے کر لے۔

حاجی مراد درنوخ سے کہتا۔

"جب تک میری فیملی آزاد نہ ہو گی، میں بے دست و پا ہوں۔ شیمل کی تباہی میں روسیوں کی کچھ مدد نہیں کر سکتا۔"

درنوخ بہلانے کو وعدہ کر لیتا۔

درنوخ جواب دیتا۔

"جنرل آرگوشکی کو آ جانے دو، اس سے مل کر اس باب میں مشورہ کروں گا۔"

حاجی مراد بولا۔

"اچھا تو جب تک مجھے یہی اجازت دے دیجئے کہ تحا (ایک چھوٹا سا سرحدی قصبہ) میں جا کر برائے چندے رہوں اور وہاں پہنچ کر شیمل کے چنگل سے اپنی فیملی کو آزاد کرنے کے لئے کچھ ہاتھ پیر ماروں۔"

اس نے پھر کہا۔

"تحا میں میرے حامی لوگ بھی موجود ہیں۔ مسلمانوں کی بستی ہے۔ وہاں ایک مسجد بھی ہے جس میں نماز ادا کیا کروں گا۔"

درنوخ نے آخر اسے اجازت دیتے ہوئے کہا۔

"اچھا تم تحا جا سکتے ہو۔"

پرنس درنوخ اور پیٹرس برگ کے حکام کے نزدیک حاجی مراد کا مطیع ہو جانا ایک فال نیک تھی۔

اس سے تاتاریوں کی ایک بڑی قوت سے روسی محفوظ ہو گئے تھے۔ مگر حاجی مراد کے لئے یہ اپنی زندگی کی ایک زبردست ٹریجڈی تھی۔

وہ کوہستان سے کچھ تو اپنی جان بچانے کی خاطر بھاگا تھا، کچھ شیمل کے خلاف جو اس

کے دل میں جذبہ نفرت تھا' اس نے روسیوں سے مل جانے کے لئے اسے مجبور کیا تھا۔
روسیوں میں آ ملنے کے بعد کچھ تک تو وہ مطمئن و خوش تھا کہ اس نے شمل کے خلاف میدان مار لیا مگر اپنی فیملی کو قید سے چھڑانا اب اسے خلاف توقع بہت دشوار نظر آنے لگا تھا۔

شمل نے اس کی فیملی کو قید کر لیا تھا اور یہ دھمکی دے رہا تھا کہ اس کی فیملی کے تمام افراد کو ایک دوسرے سے جدا کر کے دور کے گاؤں میں بھیج دے گا تاکہ وہ ایک دوسرے کے غم جدائی میں تڑپتے رہیں۔

شمل کی سب سے خطرناک دھمکی یہ تھی کہ وہ حاجی مراد کے جواں سال لڑکے کی آنکھیں نکلوا ڈالے گا۔

اب وہ تحا میں اس غرض سے آیا تھا کہ داغستان میں جو اس کے طرفدار موجود ہیں ان کی مدد سے اپنی فیملی کو جس طرح بھی ممکن ہے آزاد کرا لے۔

تحا میں جو آخری جاسوس اس سے آ کر ملے انہوں نے اس کو اطلاع دی کہ اس کے حامی عوار لوگ اس بات کے لئے تیار ہیں کہ اس کے اہل و عیال کو چھٹکارا دلا کر روسی سرحد میں اس کے پاس پہنچا دیں گے۔

لیکن چونکہ عوار کی تعداد بہت ہی قلیل ہے اس لئے ودینو (جہاں حاجی مراد کی فیملی قید تھی۔) پہنچ کر اپنی زندگی خطرے میں ڈالنے سے قاصر ہیں۔

انہوں نے یہ بھی کہا کہ اگر ودینو سے اس کی فیملی کسی اور جگہ منتقل ہوئی تو وہ ضرور اس کو چھڑا لائیں گے۔

اس کے جواب میں حاجی مراد نے اپنے حامیوں کے پاس کہلوا بھیجا کہ اگر وہ اس کے اہل و عیال کو آزاد کرا دیں گے تو وہ (حاجی مراد) انہیں تین ہزار روبل انعام میں دے گا۔

تحا میں مسجد اور خان کے محل کے قریب حاجی مراد کو پانچ کمروں کا ایک مکان دے دیا گیا۔ اس کا انچارج آفیسر' مترجم اور حاجی مراد کے ساتھی بھی اسی مکان میں ٹھہرے۔

اب حاجی مراد امیدوں میں اور جاسوس (فیملی کی خیر و خبر کے لئے) دوڑانے میں وقت گزارنے لگا۔ اسے گرد و نواح میں بھی گھوم پھر آنے کی اجازت تھی۔

تیئس اپریل کو جبکہ حاجی مراد گھوم پھر کو لوٹ رہا تھا تو اسے اطلاع ملی کہ اس کی عدم موجودگی میں تفلس سے پرنس درنوخ کا بھیجا ہوا ایک قاصد آیا ہوا ہے۔

مگر نماز کا وقت ہو گیا تھا تو پہلے اس نے نماز ظہر کو ترجیح دی اس کے بعد اپنے آفیسر

انچارج اور فرستادہ قاصد سے آ کر ملا۔
اس قاصد نے اسے درلوخ کا یہ پیام پہنچایا کہ بارہ تاریخ کو وہ طفلس پہنچ کر جنرل آرگوتنسکی سے ملے۔
حاجی مراد خفگی سے ملا۔
"یکشی؟"
اس نے قاصد کو پسند نہیں کیا۔
حاجی مراد نے اس سے دریافت کیا۔
"کیا تم پیسے لائے ہو؟"
قاصد نے جواب دیا۔
"ہاں۔"
حاجی مراد نے ہاتھ بڑھا کر کہا
"کہاں ہے لاؤ۔"
قاصد نے کہا' پھر روسی میں افسر سے بولا۔
"ابھی تمہیں پیسے مل جائیں گے مطمئن رہو۔"
"کیا کرے گا یہ پیسوں کا؟"
اس کا خیال تھا کہ حاجی مراد نے اس کی بات نہیں سمجھی ہو گی مگر سمجھ گیا تھا چنانچہ غصہ سے قاصد کی طرف دیکھنے لگا۔ آخر قاصد نے تھیلی نکالی اور روبل گننے لگا۔
قاصد نے مترجم کے ذریعہ حاجی مراد سے پوچھا۔
"یہاں تمہارا دل اچاٹ تو نہیں رہتا؟"
اس نے قاصد کی طرف نفرت سے دیکھا اور خاموش ہو گیا۔ مترجم نے پھر سوال دہرایا۔
آخر حاجی مراد خفگی سے بولا
"میں اس سے بات نہیں کرنا چاہتا۔ پیسے دینا ہے تو دے دے۔"
چنانچہ اسے پیسے مل گئے۔
یہ حاجی مراد کا الاؤنس تھا۔ اس کو روزانہ سونے کے پانچ سکے ملتے تھے حراجی مراد نے اپنی رقم گنی اور آستین میں بھرلی پھر ایک دم اٹھ کھڑا ہوا اور قاصد کی گنجی چندیا پر ایک چپت مار کر چلایا۔

قاصد بے حد خفا ہوا اور مترجم سے چیخ کر بولا

"اس سے کہو کہ بدتمیزی نہ کرے۔ میرا عہدہ کرنل کے برابر ہے۔"

حاجی مراد نے مڑکر دیکھا اور روانہ ہوا۔

انچارج آفیسر قاصد سے بولا۔

اس شخص کے متعلق کیا کرنا چاہئے۔"

قاصد نے کہا۔

"یہ خطرناک آدمی ہے۔ کسی روز کسی شخص کے خنجر بھونک دے گا۔"

شام ہو چکی تھی' جب اندھیرا پھیلنے لگا تو دو جاسوس جن کے چہرے چھپے ہوئے تھے۔ آئے اور آفیسر انچارج سے چند منٹ بات کی' آفیسر انہیں حاجی مراد کے پاس لے گیا۔

جاسوسوں میں ایک تو موٹا تازہ آدمی تھا اور دوسرا دبلا پتلا اور عمر رسیدہ جو خبریہ جاسوس لے کر آئے تھے وہ اچھی نہ تھی۔ انہوں نے اطلاع دی کہ حاجی مراد کے جن دوستوں نے شمل کے قبضے سے اس کی فیملی کو نکالنے کا وعدہ کیا تھا اب منحرف ہو گئے ہیں کیونکہ شمل نے اعلان کیا ہے کہ جو کوئی حاجی مراد سے ذرا سا بھی واسطہ رکھے گا اسے سخت ترین سزا دی جائے گی۔

اس خبربد کو سن کر حاجی مراد سر لٹکائے سناٹے میں بیٹھ گیا۔ بہت دیر تک کچھ سوچتا رہا۔

اسے احساس ہوتا جا رہا تھا کہ اپنی فیملی کے اہم ترین مسئلہ رہائی کے متعلق وہ اب تک کوئی دو ٹوک فیصلہ نہیں کر سکا ہے۔ ضرورت تھی کہ اب جلد از جلد کسی آخری نتیجے پر پہنچے۔

آخر اس نے اٹھایا اور دونوں جاسوسوں کو ایک ایک سونے کا سکہ دیا۔

اس نے جاسوس سے کہا۔

"اچھا اب جاؤ۔"

جاسوسوں نے دریافت کیا۔

"آخر آپ نے کیا طے کیا؟"

حاجی مراد نے تفکر سے کہا۔

"بس تم لوگ جاؤ۔ وہی ہو گا جو خدا کو منظور ہے۔"

جاسوسوں کے چلے جانے کے بعد حاجی مراد بڑی دیر تک عالم استغراق میں بیٹھا رہا۔

اس نے سوچنا شروع کیا۔
"آخر مجھے کیا کرنا چاہئے۔"
کیا شمل کے الفاظ پر یقین لا کر اس کے پاس چلا جاؤں۔ وہ لومڑی کے مانند ہے۔ مجھے فریب دیئے بغیر نہیں رہے گا۔ اور اگر اس نے مجھے بفرض محال دھوکا نہیں بھی دیا تب بھی یہ میرے لئے ناممکن ہے کہ اس کاذب کی تابعداری کروں۔
پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ میں چونکہ روسیوں سے آ ملا ہوں تو ویسے بھی وہ مجھ پر اعتبار نہیں کرے گا۔
اسے اپنی مثال میں ایک باز کی حکایت یاد آ گئی جو انسانوں میں رہ کر ان سے مانوس ہو گیا تھا۔ انسانوں نے اس کے پنجوں میں (خوب صورتی کے لئے) گھنگرو باندھ دئے تھے۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد باز واپس اپنی برادری میں لوٹا تو انہوں نے اسے قبول نہیں کیا۔
دوسرے باز بولے۔
"جہاں سے یہ چاندی کے گھنگرو باندھ کر آئے ہو وہیں واپس چلے جاؤ۔" باز اپنا وطن چھوڑ کر واپس انسانوں میں نہیں جانا چاہتا تھا۔ لہٰذا وطن ہی میں رہ پڑا لیکن اس کی برادری والوں نے چونچیں مار مار کر اسے مار ڈالا۔
حاجی مراد سوچنے لگا۔
"میرے ہم وطن بھی میرے ساتھ یہی سلوک کریں گے۔ مجھے مارے بغیر نہیں رہیں گے۔"
"پھر کیا میں روسیوں ہی میں رہ پڑوں اور حکومت زار کے لئے تمام قفقاز کا علاقہ فتح کر کے نام' عزت اور دولت حاصل کروں۔"
حاجی مراد نے درنوخ سے اپنی ملاقات کے مواقع یاد کرتے ہوئے سوچا'
"ایسا ہو تو سکتا ہے۔"
درنوخ نے اس سے بہت سے سنہری وعدے کئے تھے۔
حاجی مراد نے خود سے کہا۔
"کچھ بھی ہو مجھے بہت جلد کسی آخری فیصلے پر پہنچنا چاہئے' ورنہ شمل میری فیملی کو تہ تیغ کر دے گا۔"
چاروں طرف اندھیرا چھا چکا تھا۔ آج رات کو حاجی مراد سو نہ سکا۔

آخر نصف شب تک حاجی مراد کسی فیصلہ پر پہنچ گیا۔ اس نے یہ طے کیا کہ واپس کوہستان میں لوٹ جائے اور ودینو پر اپنے چند رفقاء کے ساتھ جا چڑھے (ودینو میں شمل رہتا تھا اور یہیں حاجی مراد کی فیملی قید تھی)

اس کوشش میں مقدر نے ساتھ دیا تو کامیاب ہو جائے گا اور اگر موت آنے والی ہو گی تو جان دے دے گا۔

اپنی فیملی کو آزاد کرانے کے بعد آیا وہ واپس روسیوں سے آ ملے گا۔ یا شمل سے جنگ آزما رہے گا۔ اس مسئلہ پر اس نے سردست غور کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

اس فیصلہ کے بعد اب اس کی پہلی کوشش یہ ہوئی کہ جلد روسی سرحد سے نکل بھاگے۔

چنانچہ اس کے لئے وہ راتوں رات تیاری میں مصروف ہو گیا۔ اس نے سرہانے سے اپنی سیاہ چادر نکالی اور اپنے رفقا کے کمرے میں پہنچا۔ چاروں طرف آدھی رات کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔

باہر نکلتے ہی شب کی کہر نے اسے گھیر لیا۔ آس پاس کی جھاڑیوں اور باغیچوں میں جھینگر راگنی الاپ رہے تھے۔

دروازہ کھول کر وہ اپنے ساتھیوں کے کمرے میں پہنچا۔ یہاں اندھیرا تھا۔ بیچ میں ایک میز اور چند تپائیاں پڑی تھیں اور فرش پر چاروں اس کے ساتھی پڑے ہوئے نیند نکال رہے تھے۔

حنیف کا مونہہ دروازے کی طرف تھا۔ جہاں گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ دروازے کی آہٹ سے غمزالو کی آنکھ کھل گئی۔

اس نے حیرت سے دیدے پھاڑ کر دیکھا تو اسے حاجی مراد کھڑا ہوا نظر آیا۔ چنانچہ ایک دم تیار ہو گیا تاکہ اگر اس کا آقا کوئی حکم دے تو فورا بجا لائے۔

خاں محمد اور بطا غافل سو رہے تھے۔ وجیہہ خوشرو الدر کی بھی آنکھ کھل گئی اور وہ بھی اپنے آقا کو دیکھ کر فورا تیار ہو گیا۔

حاجی مراد نے سونے کے سکے (جو اسے کل ہی الاؤنس کے طور پر ملے تھے) الدر کو

دیتے ہوئے کہا تھا۔

"انہیں کسی کپڑے میں باندھ لو۔"

حاجی مراد نے غمزالو کو حکم دیا۔

"اچھا غمزالو تم ان لوگوں کو جگاؤ اور فورا بندوق - پستول، گولی بارود وغیرہ جمع کر لو۔

کل ہمیں لمبا سفر کرنا ہے۔

غمزالو نے کہا۔

"ہمارے پاس کافی گولیاں اور بارود موجود ہے۔ اطمینان رکھیں سب چیز تیار ملے گی۔"

غمزالو فورا سمجھ گیا کہ اس کے آقا کا مقصد کیا ہے۔

ابتدا ہی سے غمزالو روسی سرحد سے بھاگ جانے کا خواہش مند تھا اور بھاگتے بھاگتے بہت سے روسیوں کے پیٹ میں خنجر بھونک دینا چاہتا تھا۔ اب حاجی مراد کو بھی اس نے اسی بات کا خواہاں پایا تو بہت خوش ہوا۔

جب حاجی مراد واپس چلا گیا تو غمزالو نے اپنے ساتھیوں کو بیدار کیا۔ چنانچہ سب خاموشی سے تمام رات اپنے اسلحے کی درستی اور تیاری میں مصروف رہے۔

صبح صادق سے قبل حاجی مراد نے اپنے ساتھیوں کے کمرے کا ایک چکر اور لگایا۔ جھینگروں کا شور صبح ہوتے ہوتے اور تیز ہو گیا تھا۔ وضو کرنے کے بعد حاجی مراد اپنے کمرے میں آگیا۔ اس کے کانوں میں حنیف کے اسی گانے کی آواز آ رہی تھی جو موت و حیات کے متعلق تھا۔ حاجی مراد غور سے سننے لگا اس کے بعد حنیف نے ایک گیت اور چھیڑا، جس کا مفہوم یہ تھا کہ بہادر تاتاریوں نے کس قدر جانبازی سے روسیوں کی ٹڈی دل فوج کا مقابلہ کیا تھا اور اپنی بندوقوں کی آخری گولی تک دشمن سے لڑتے رہے تھے۔

فوج کا سردار ہمداد شمشیر بکف مرتے دم تک روسیوں کا مقابلہ کرتا رہا اور جب مرنے لگا تو آسمان پر اڑتی ہوئی چیلوں سے یوں مخاطب ہوا :

"پرندو اڑتے رہو اور اڑتے اڑتے ہماری ماں اور بہنوں کو جا کر حال سناؤ۔

حسینان صبیح سے جا کر کہو کہ لڑتے لڑتے ہم کام آئے۔

ہم نے جہاد کیا، ان سے جا کر کہو کہ ہمارے لاشے مقبروں میں آرام کریں گے۔

یا بھیڑیے اور جنگلی جانور ہماری لاشوں پر دعوت اڑائیں گے۔

اور گدھ ہماری آنکھیں نکال کر کھالیں گے۔

ان دردناک الفاظ کے بعد گیت ختم ہو گیا اور پھر چاروں طرف خاموشی مرگ طاری

ہو گئی۔

صرف یا تو جھینگروں کا نوحہ باقی رہ گیا تھا یا پتھر پر خنجر وغیرہ کو صیقل کرنے کی آواز۔

حاجی مراد اپنے خیالات میں کچھ اس قدر کھویا ہوا تھا کہ برتن میں پانی بھرنے لگا تو برتن کے چھلک جانے پر بھی اس میں پانی ڈالے گیا۔

اپنے دل سے باتیں کرتے کرتے اس نے خود ہی سر ہلایا اور واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔

(حاجی مراد اپنے کوہستانی علاقے سے بھاگ کر روسیوں سے صرف اس توقع پر آ ملا تھا کہ ان کی مدد سے وہ اپنی فیملی کو شیمل کی قید سے رہائی دلا سکے گا۔

کون ایسا انسان ہو گا جو اپنی بوڑھی ماں، جوان پوت، چھوٹے چھوٹے بچے اور اپنی ناموس کو کسی دشمن کی اذیت آفریں قید میں پڑا ہوا دیکھ کر نہ تڑپے گا۔

روسیوں میں آ کر حاجی مراد نے پرنس درنوخ کے علاوہ ایک ایک روسی افسر کی منتیں کیں کہ اس کے ہمراہ تھوڑے سے آدمی کر دیئے جائیں تاکہ وہ اپنے اہل و عیال کو رہائی دلا کر لے آئے۔

وعدے سب نے اس سے کیئے مگر ایفا کسی نے نہیں کیا۔ اپنی فیملی کے غم میں اس کے تڑپنے کا تماشہ سب نے دیکھا۔ مگر مدد کو کوئی نہ بڑھا۔

آخر انتہائی مایوسی کے عالم میں حاجی مراد کو یہی فیصلہ کرنا پڑا کہ روسیوں کے پاس سے بھاگ چھوٹے اور اپنی فیملی کو چھٹکارہ دلائے چاہے اس میں جان چلی جائے۔

چنانچہ اس وقت وہ مع اپنے ساتھیوں کے روسی سرحد سے چپکے سے نکل جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اسے اپنی جان کا کوئی خوف نہ تھا، صرف اپنی بیوی بچوں کا خیال آ رہا تھا۔

فجر کی نماز سے فارغ ہو کر حاجی مراد نے اپنے اسلحہ کا جائزہ لیا، اور پلنگ پر بیٹھ گیا۔

اسے کچھ اور زیادہ نہیں کرنا تھا۔ گھوڑے پر سوار ہو کر باہر نکلنے کے لئے اسے افسر انچارج کی اجازت لینا پڑتی تھی۔ لیکن ابھی آفتاب طلوع نہیں ہوا تھا۔ آفیسر پڑا سو رہا تھا۔

حنیف کے ابھی ابھی گائے ہوئے گیت سے حاجی مراد کو اپنی ماں کا تصور آنے لگا کیونکہ یہ گیت اس کی والدہ ہی نے اپنے شوہر کے لئے جوڑا تھا۔ اس وقت تخیل میں اسے اپنی ماں کا جھریوں سے ڈھکا ہوا چہرہ اور سفید بال وغیرہ نظر نہیں آ رہے تھے بلکہ عالم خیال میں وہ اسے جواں و خوب صورت دیکھ رہا تھا۔

اور اسے اتنا ہی مضبوط و طاقت ور پا رہا تھا جتنا وہ اس زمانے میں تھی جب کہ اسے

کمر سے باندھ کر پہاڑیوں پر لئے پھرتی تھی۔

پھر اپنے لڑکپن کا خیال آیا۔ اس خیال نے اس کے دل میں اپنے خود کے بیٹے کی یاد تازہ کر دی۔ عقیقہ کے موقع پر اپنے بیٹے یوسف کا سر خود اسی نے مونڈا تھا۔

وہ یوسف کو جس حالت میں چھوڑ آیا تھا اسی حالت میں وہ تصور میں یوسف کو دیکھ رہا تھا۔ کس طرح یوسف اس کا گھوڑا تیار کر کے لایا تھا اور اس نے کس طرح اپنے والد کے ساتھ چلنے کا اصرار کیا تھا۔

کتنا خوب صورت ہے یوسف۔ ہزاروں میں ایک۔ پھر نڈر اور دلاور زندگی اور امنگوں سے بھرپور۔ پھر جنگ جو لوگوں کے اس کے لمبے ہاتھ۔ چیتے کی سی کمر۔ حاجی مراد اپنے بیٹے پر خیال ہی خیال میں فخر کر رہا تھا۔

"میرے بچے تو یہیں رہ۔ ضد نہ کر۔ اگر تو میرے ساتھ ہو لیا تو یہاں تیری ماں اور دادی اکیلی رہ جائیں گی' ان کی کون نگرانی کرے گا۔"

حاجی مراد نے عالم خیال میں بوقت جدائی اپنے لڑکے سے کہے ہوئے الفاظ یاد کرتے ہوئے سوچنا شروع کیا۔

ان الفاظ کو سن کر نو عمر خوب رویا اور بہادر یوسف نے کیا جواب دیا۔ اس کے الفاظ بھی حاجی مراد کو یاد آئے۔

اس نے کہا تھا۔

ابا فکر نہ کیجئے۔ جب تک میری جان میں جان ہے۔ امی اور دادی اماں کا کوئی بال تک بیکا نہیں کر سکتا۔

یہ الفاظ اس نے بڑی خود اعتمادی اور وثوق کے ساتھ کہے تھے۔ اس کے بعد یوسف اپنے والد کو چشمے تک چھوڑنے گیا تھا۔ بس وہ اپنے بیٹے کا آخری دیدار تھا۔ اس کے بعد سے آج تک اسے اپنے لڑکے' ماں اور بیوی کی صورت دیکھنا نصیب نہیں ہوئی تھی۔

یوسف کی خوب صورت آنکھیں بہ حسرت دور تک اپنے جدا ہونے والے باپ کو دیکھتی رہی تھیں۔ ظالم شمل ان خوب صورت آنکھوں کو لوہے کی گرم گرم سیخوں سے پھوڑ ڈالنا چاہتا ہے۔ پھر اس کی بیوی کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا جائے گا۔ حاجی مراد اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

ان خیالات سے وہ اس قدر جوش میں بھر گیا کہ اس کا جسم ہل اٹھا۔ وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا اور لنگڑاتا ہوا دروازے کی طرف تیزی سے بڑھا۔ دروازہ کھولا اور الدر کو آواز

دی۔

آفتاب اب تک طلوع نہیں ہوا تھا مگر چاروں طرف اجالا پھیل چکا تھا۔
جھینگر اب بھی آہستہ سروں میں گا رہے تھے۔
الدر کے آنے پر حاجی مراد نے اس سے کہا۔
"جاؤ اور آفیسر انچارج سے کہو کہ میں ذرا گھوڑے پر سوار ہو کر گھوم پھر آتا ہوں اور جا کر گھوڑا تیار کرو۔"

بٹلر کی آخری تسکین کا ذریعہ اب صرف رجزیہ گیت تھے۔ زمانہ ملازمت ہی میں نہیں بلکہ پہلے ہی سے وہ ان کا دل دادہ تھا۔

اس نے تاتاری لباس زیب تن کیا۔ اور گھوڑے پر کاوے کاٹنے لگا دو تین بار بگدا نووش کے ساتھ ساتھ گھات میں بھی بیٹھا مگر کسی کو مارنے یا فائر کرنے کی نوبت نہ آئی۔

بگدا نووش سے دوستانہ تعلقات ہو جانے سے بٹلر کو مسرت تھی' کیونکہ وہ (بگدا نووش) بڑا جری شخص تھا۔

جوئے میں ہارے ہوئے روپے کا قرضہ وہ ادا کر چکا تھا۔ یہ روپیہ اسے ایک یہودی سے بڑے سود پر لینا پڑا تھا۔ اس کا اسے زیادہ افسوس نہ تھا۔ رجزیہ کلام اور شراب سے دل بہلاتا رہتا۔

اب بٹلر کثرت سے شراب پینے لگا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روز بروز اخلاقی اعتبار سے کمزور ہوتا چلا جا رہا تھا۔

اب ماریہ کے لئے بھی اس کے اگلے پاکبازانہ خیالات نہیں رہے تھے (یہ وہی ماریہ تھی جس کا شوہر میجر پتروف تھا جس کے مکان میں قلعہ کے اندر حاجی مراد چند روز کے لئے فروکش ہوا تھا۔ ایک شہزادی ماریہ تھی جس کا شوہر پرنس ورنوخ تھا۔)

اب بٹلر ماریہ سے بھی آشنائی کرنے کی فکر میں رہتا تھا۔ مگر ماریہ اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرتی تھی۔

اپنے ان اقدامات پر بٹلر کو مونہہ کی کھانی پڑی تھی۔

ماہ اپریل کے اختتام پر قلعہ میں کچھ فوج آئی جس سے کام لینے کا مجاز تنہا جنرل بریان تسکی تھا وہ اس فوج کو شیشیا کی مہم میں لگانا چاہتا تھا۔

یہ فوج دو کبردا کی رجمینٹ پر مشتمل تھی اور تاتاری مراسم کے پیش نظر کورین کی رجمنٹ کے لئے اس فوج کی حیثیت مہمان کی سی تھی۔

ان سپاہیوں کو بارکوں میں ٹھیرایا گیا اور ان کی خاطر تواضع کی گئی۔

اس فوج کے افسر کورین رجمینٹ کے افسروں کے ساتھ فروکش ہوئے۔ ان دعوتوں میں میجر پتروف بھی شریک تھا۔

اس کی شراب نوشی کا اب بھی وہی عالم تھا اور تلوار سے خیالی دشمنوں کو قتل کرنے میں مصروف رہتا تھا۔ کبھی ہنستا اور کبھی اس گانے کی گت پر ناچنے لگتا۔
پچھلے وقتوں میں شمیل نے فساد پھیلایا تھا۔
بٹلر بھی اس محفل میں موجود تھا۔ اس گیت میں وہ بھی جنگی ترنم ٹٹولنے لگا۔ مگر دل میں میجر پتروف کے حال پر افسوس کر رہا تھا۔
میجر کو ناچنے یا طفلانہ حرکات سے باز رکھنا مشکل تھا۔ بٹلر پر بھی نشہ طاری ہونے لگا تھا۔ اس لئے اس نے عافیت اسی میں سمجھی کہ اٹھ کر چلا جائے۔
چو طرف چاندنی پھیلی ہوئی جس سے درو دیوار روشن ہو رہے تھے دور دور تک سڑک نمایاں نظر آ رہی تھی۔ چاند اس قدر شفاف تھا کہ اس کی روشنی میں ذرہ ذرہ چمک رہا تھا۔
بٹلر جب مکان کے قریب پہنچا تو ماریہ سے مڈ بھیڑ ہو گئی۔ ماریہ نے سروشانہ پر شال ڈال رکھا تھا۔
جب سے اس نے بٹلر کے حوصلے توڑے تھے۔ وہ اس سے کترانے لگا تھا۔ کیونکہ اس پر ندامت و پشیمانی سی طاری ہو جاتی تھی۔ مگر اس وقت ایک تو مخمور ہو رہا تھا' دوسرے دل فریب چاندنی پھیلی ہوئی تھی چنانچہ اس وقت ماریہ کو دیکھ کر اسے مسرت ہوئی۔
بٹلر نے ماریہ سے پوچھا۔
"کہاں چلیں؟"
ماریہ نے جواب دیا۔
"اپنے بڑے میاں کو دیکھنے۔"
اس نے دل سے بٹلر کو مسترد کر دیا تھا مگر یہ چاہتی تھی کہ وہ اس سے کترایا نہ کرے۔
بٹلر بولا۔
"اس کی کیا فکر کر رہی ہو۔ آپ آ جائے گا۔"
ماریہ بولی۔
"مگر کیا وہ خود آنے کے قابل رہے گا بھی؟"
بٹلر نے کہا۔
"اگر وہ خود چلنے کے قابل نہ رہا تو لے آیا جائے گا۔"
ماریہ بولی۔
"کیا پھر میں بھی نہ جاؤں؟"

بٹلر نے کہا۔

"میرا تو یہ خیال ہے کہ مکان میں چلیں۔"

چنانچہ ماریہ بھی لوٹ گئی اور اس کے پیچھے پیچھے ہو لی۔ چاندنی اتنی صاف چھٹکی ہوئی تھی کہ سڑک پر ان دونوں کے سروشانہ کے سائے ہالہ سے نظر آ رہے تھے۔ بٹلر اپنے سر کے ہالہ کو دیکھتا ہو چل رہا تھا اور سوچتا جا رہا تھا کہ.ماریہ پر یہ ظاہر کر دے کہ وہ اب بھی اسے اتنا ہی پسند کرتا ہے جتنا پہلے کرتا تھا لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ابتدا کس طرح کرے۔

ماریہ منتظر تھی کہ بٹلر کچھ بات کرے۔ مگر دونوں مکان کے قریب تک خاموشی سے راستہ طے کرتے رہے۔ دفعتہ" موڑ پر چند سواروں کے نمودار ہونے سے دونوں چونک اٹھے۔ سواروں میں ایک افسر تھا اور باقی اس کے ماتحت۔

ماریہ نے ایک طرف ہٹتے ہوئے کہا۔

"یہ اس وقت کون لوگ آ رہے ہیں۔"

چاند آنے والے سوار افسر کے عقب میں چمک رہا تھا۔ اس لئے وہ اسے پہچان نہ سکی۔ یہاں تک کہ وہ بالکل قریب آ پہنچا۔ اس افسر کا نام پیٹر تھا جو ماریہ کے شوہر میجر پتروف کے تحت میں کام کرتا تھا۔ اس لئے ماریہ اس سے واقف تھی۔

ماریہ نے اسے پہچانتے ہوئے کہا

"کون پیٹر۔ تم ہو؟"

اس نے جواب دیا' پھر بٹلر سے مخاطب ہوا۔

"جی ہاں میں ہوں۔"

پیٹر نے کہا۔

"اوہو بٹلر۔ کیسا مزاج ہے۔ اب تک سوئے نہیں۔ ماریہ کے ساتھ چاندنی رات کا لطف لے رہے ہو۔ دیکھنا کہیں میجر کو خبر نہ ہو جائے لیکن میجر صاحب ہیں کہاں؟"

ماریہ بولی۔

"وہ وہاں سامنے کا مکان میں داد عیش دے رہے ہیں۔ آج ضیافت اڑائی جا رہی ہے۔"

پیٹر نے کہا۔

"خوب! کیا قلعہ والے آپس میں ہی ضیافت کا اہتمام کرتے رہتے ہیں۔"

"نہیں ہسوف یاربت سے چند آفیسر آئے ہوئے ہیں۔ ان کی تواضع کی جا رہی ہے۔"
پیٹر نے کہا۔
"خوب۔ میں بھی بڑے اچھے وقت پر آ پہنچا۔ لیکن پہلے چند منٹ کے لئے میجر صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔"
بٹلر نے دریافت کیا۔
"کیا کوئی معاملہ کی بات ہے؟"
پیٹر نے جواب دیا۔
"ہاں کچھ یوں ہی سمجھو"
"کوئی اچھی بات ہے یا شر انگیز؟"
پیٹر نے کہا۔
"اس کا کیا جواب دیا جائے۔ بہرحال اپنے لئے تو اچھی ہی سمجھنا چاہئے۔ دوسروں کے لئے بری ہو گی۔
اس کے بعد تینوں باتیں کرتے کرتے میجر کے مکان کے قریب آ گئے۔
پیٹر نے اپنے سواروں میں سے ایک سوار کو آواز دی۔
"شیروف۔ یہاں آؤ۔"
چنانچہ ایک کاسیک سوار جس نے اونچے بوٹ پہن رکھے تھے اور اس کے گھوڑے کی کاٹھی کے پیچھے تھیلے لٹکے ہوئے تھے۔ اپنا گھوڑا دوڑا کر آیا۔
پیٹر نے سوار سے کہا۔
"تھیلا کھول لاؤ اور اس چیز کو باہر نکالو۔"
سوار ایک چمڑے کا تھیلا کھول لایا اور پیٹر کے حوالے کیا۔ پیٹر نے اس میں ہاتھ ڈالا۔
پیٹر نے کہا۔
"میں تمہیں ایک طرفہ چیز دکھانا چاہتا ہوں۔ تم ڈرو گی تو نہیں ماریہ؟"
ماریہ بولی۔
"میں ڈرنے کی عادی نہیں ہوں۔"
"اچھا تو لو دیکھو" پیٹر نے کہا اور تھیلے میں سے ایک کٹا ہوا انسانی سر نکالا اور پھر اس کا رخ چاند کی طرف کرتے ہوئے بولا۔
"پہچانتی ہو اسے؟"

اس بریدہ سر کے بال منڈے ہوئے تھے۔ اس کی ٹھوڑی پر سیاہ خشخاشی داڑھی تھی۔ موچھیں تھیں۔ ایک آنکھ بند تھی اور دوسری نیم وا تھی۔

منڈی ہوئی کھوپڑی پر زخم تھے مگر زیادہ گہرے نہیں۔ اور اس کے نتھنوں میں جما ہوا خون بھرا ہوا تھا۔ کٹی ہوئی گردن خون سے تر بتر ایک تولئے میں لپٹی ہوئی تھی۔

کٹے ہوئے سر پر کئی زخموں کے نشانات کے باوجود خشک پپڑی جمے ہوئے نیلے ہونٹوں پر ایک ملائم و معصومانہ سا تبسم نظر آ رہا تھا۔

ماریہ اس بریدہ سر کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی' اس کے بعد مونہہ سے ایک لفظ نکالے بغیر مڑی اور جلدی سے اپنے مکان کے اندر چلی گئی۔

بٹلر بھی اس خوفناک منظر اور کٹے ہوئے سر کو دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ یہ حاجی مراد ہی کا کٹا ہوا سر تھا! حاجی مراد کے ساتھ بٹلر نے کچھ روز قبل کس قدر دوستانہ بے تکلفی کے چند دن گزارے تھے۔

آخر بٹلر کے مونہہ سے نکلا۔

"کس نے اسے قتل کر ڈالا؟"

ہا میں! یہ کیا؟"

پیٹر نے جواب دیا۔

یہ ہماری سرحد سے نکل بھاگا تھا مگر پکڑا گیا۔

اور اس نے یہ سربریدہ واپس سوار کو دے دیا۔ پھر بٹلر کے ساتھ مکان میں داخل ہوا۔ پیٹر نے کہا

"بڑی جواں مردی سے حاجی مراد نے مقابلہ کیا تھا اور بڑی بہادری کی موت مرا۔"

بٹلر نے پوچھا۔

"لیکن یہ سب کچھ ہوا کس طرح۔ اس کی تفصیل کیا ہے؟"

پیٹر نے جواب دیا۔

"ذرا توقف کرو' میجر آ جائے تو میں تمام واقعہ سناؤں گا۔ میں یہاں اسی لئے آیا ہوں کہ اس سر کو تمام قلعوں اور تاتاری بستیوں میں دکھاتا پھروں"

چند منٹ بعد میجر کو بلوایا گیا جو مع اور دو افسروں کے آ گیا مگر تینوں نشے میں بدمست ہو رہے تھے۔ میجر آ کر پیٹر سے بغل گیر ہوا۔

پیٹر نے اطلاع کے طور پر میجر سے کہا۔

"میں آپ کے پاس حاجی مراد کا کٹا ہوا سر لایا ہوں۔"
میجر نے نشے میں پوچھا۔
"ایں۔ اچھا ------ کیا وہ مارا گیا؟"
پیٹر نے جواب دیا۔
"ہاں کیونکہ نکل بھاگنا چاہتا تھا۔"
میجر نے کہا۔
"میرا پہلے ہی خیال تھا کہ وہ ہمیں چکمہ دے گا۔ اچھا سر ہے کہاں۔ ذرا دکھانا مجھے بھی۔"
چنانچہ پھر اسی سوار کو آواز دی گئی۔ جو تھیلا لے آیا جس میں حاجی مراد کا سر تھا میجر اپنی نشہ زدہ آنکھوں سے سر کو دیر تک دیکھتا رہا۔
میجر نے کہا۔
"وہی ہے۔ خوب آدمی تھا۔ لاؤ میں اس کے سر پر بوسہ دوں۔"
ایک افسر بولا۔
"ہاں واقعی بہت خوب انسان تھا۔ یہ ایک جواں مرد کا سر ہے۔"
جب تمام لوگ اس کا معائنہ کر چکے تو اسے واپس سوار کے حوالے کر دیا گیا۔ جس نے واپس اس کو تھیلے میں رکھ لیا۔
ایک افسر نے دریافت کیا۔
"اچھا اس سر کی نمائش پر کیا تقریر کرو گے میجر؟"
میجر نے کہا۔
کچھ نہیں۔ میں تو اسے بوسہ دوں گا۔ اس نے مجھے ایک تلوار پیش کی تھی۔
بٹلر باہر نکل کر برآمدے میں آ گیا۔ ماریہ بھی وہیں ایک سیڑھی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ بٹلر کو دیکھتے ہی غصہ سے اٹھ کر چل دی۔
بٹلر نے اس سے پوچھا۔
"کیا ہوا ماریہ۔ کیا بات ہے؟"
ماریہ نے کہا اور پھر جانے لگی۔
"تم سب گلا کٹ ہو۔ قصائی ہو۔ میں اس سے سخت نفرت کرتی ہوں"
بٹلر نے کہا۔

"اس قسم کا واقعہ ہر شخص کے ساتھ پیش آنا ممکن ہے۔ جنگ میں ایسا ہی ہوتا ہے۔"

ماریہ غصہ سے بولی۔

"جنگ! کیا یہ جنگ تھی! قصائی کہیں کے۔ لاش زمین کے سپرد کی جاتی ہے۔ مگر تم لوگ اس پر شادیانے بجا رہے ہو۔ قصائی ہو قصائی۔"

سیڑھی طے کر کے پچھلے دروازے سے مکان میں چلی گئی۔ بٹلر واپس کمرے میں آگیا اور پیٹر سے اس حادثے کی تمام تفصیل دریافت کرنے لگا۔

چنانچہ پیٹر نے یہ تمام حکایات خونیں اس طرح بیان کی۔

حاجی مراد کو اجازت تھی کہ گھوڑے پر سوار ہو کر قصبہ کے نواح میں جا سکتا تھا مگر شرط یہ تھی کہ روسی سوار ہمیشہ اس کے ساتھ رہیں گے' جہاں کہیں جائے گا سپاہیوں کی تحویل میں ہو کر جائے گا۔

تحا میں (روسی سرحدی قصبہ جہاں آج کل حاجی مراد مقیم تھا) بہت تھوڑی سی روسی سپاہ تھی۔

اس دستہ میں سے دس آدمی تو افسروں کے کام کاج ہی کے لئے تھے۔ یہی دس آدمی حاجی مراد کو (جیسا کہ حکم تھا۔) اپنی تحویل میں لے کر نکلا کرتے تھے۔

دو چار روز کے بعد آخر یہ طے کیا گیا کہ دس کے بجائے صرف پانچ آدمی نگرانی کو کافی ہیں۔

مگر حاجی مراد کو یہ ہدایت کر دی گئی تھی کہ وہ بھی جب کبھی باہر جایا کرے تو اپنے سب ساتھیوں کو ہمراہ نہ لے جایا کرے۔

لیکن پچیس اپریل کو حاجی مراد اپنے پانچوں ساتھیوں کو ہمراہ لے کر نکلا۔ جب وہ گھوڑے پر سوار ہونے لگا تو روسی افسر نے اس سے کہا کہ اپنے پانچوں ہمراہیوں کو ساتھ لے جانے کی اسے اجازت نہیں ہے۔

مگر حاجی مراد سنی ان سنی کر کے سوار ہو گیا اور مع اپنے ساتھیوں کے چل دیا۔ افسر نے زیادہ مزاحمت نہیں کی

بہرحال حسب معمول آج بھی حاجی مراد پانچ روسی سواروں کی تحویل میں تھا جن کا افسر نزروف نامی ایک نوجوان شخص جس نے حال ہی میں اپنی دلاوری کی بنا پر سینٹ جارج تمغہ حاصل کیا تھا۔

نزروف ایک نو عمر و تندرست انسان تھا' جوش و خروش اور امنگوں سے معمور۔ ایک قدامت پرست و غریب خاندان کی سب سے بڑی اولاد میں سے تھا۔ بچپن ہی میں یتیم ہو گیا تھا اور اب ایک بوڑھی ماں۔ تین بہنوں اور دو بھائیوں کا بار اسی کے کاندھوں پر تھا۔

چلتے وقت کمانڈر نے نزروف سے کہا۔

"نزروف ہوشیار رہنا اور حاجی مراد پر نگاہ رکھنا۔"
نزروف نے جواب دیا۔
"بہت اچھا جناب عالی۔"
پھر اپنے چابک اور بندوق کو سنبھال کر اس نے اپنا قوی گھوڑا حاجی مراد کے پیچھے لگا دیا۔

اس کی ماتحتی میں چار سوار اور چل رہے تھے' ان میں سے ایک کا نام فیراپونوف تھا۔ یہ شخص بڑا ہی چور تھا۔ اسی نے روسی میگزین سے بارود چرا کر حاجی مراد کے ملازم غمزالو کے ہاتھ فروخت کیا تھا۔

دوسرے روسی سوار کا نام اگناتوف تھا۔ وہ موٹا تازہ اور ایک شیخی باز قسم کا انسان تھا۔ پہلے اس کا پیشہ کاشتکاری تھا۔ اس کی عمر بھی زیادہ تھی۔

تیسرے سوار کا نام مشکین تھا۔ بالکل لڑکا ہی سا ہو گا۔ اس کا ہر شخص مذاق اڑایا کرتا تھا۔

چوتھے کا نام پڑوکوف تھا۔ لاپرواہ و زندہ دل۔

آج صبح بڑی کھرپڑ رہی تھی۔ تازہ تازہ اچھوتی ہری گھاس۔ غلے کے ہنستے ہوئے دانے اور بائیں جانب مترنم و تیز رو دریا کی روانی' بڑا سہانا منظر تھا۔

حاجی مراد مع اپنے پانچوں ساتھیوں کے ان پانچ روسی سواروں کی تحویل میں اپنا گھوڑا آہستہ آہستہ چلا رہا تھا۔

قلعہ سے نکل کر دور تک سڑک پر یہ لوگ آہستہ آہستہ چلتے رہے راہ میں انہیں کئی عورتیں ملیں جو اپنے سروں پر ٹوکرے لئے چلی جا رہی تھیں۔ سپاہی بھی ملے جو گاڑیاں ہانکتے جا رہے تھے۔

جب حاجی مراد ایک یا ڈیڑھ میل نکل گیا تو اس نے اپنے گھوڑے کو ایڑ دے کر تیز دوڑانا شروع کیا۔

تقلیداً اس کے پانچوں ساتھیوں نے بھی اپنے گھوڑے تیز کر دئے اور تاکہ ان سے پیچھے نہ رہ جائیں۔ روسی سواروں کو بھی اپنے گھوڑے تیز کرنے پڑے۔
فیرانوکوف بولا۔
"دیکھو حاجی مراد کا گھوڑا کس قدر جی دار ہے۔ اگر حاجی مراد دشمن ہوتا تو میں ابھی اسے زیر کئے بغیر نہ رہتا۔

دوسرا سوار بولا۔

حاجی مراد کے گھوڑے کی قیمت تفلس میں تین سو روبل میرے سامنے لگ چکی تھی۔

نزروف (افسر) نے کہا۔

"لیکن میرا گھوڑا اس کے گھوڑے سے آگے نکل سکتا ہے۔"

تیسرے سوار نے کہا۔

"آپ نکل سکتے ہیں آگے؟ ہم بھی دیکھیں گے۔"

اب حاجی مراد نے اپنا گھوڑا اور بھی زیادہ تیز کر دیا۔

نزروف نے حاجی مراد کو آواز دیتے ہوئے کہا۔

"اے کناخ (دوست یا بھائی) یہ کیا کر رہے ہو۔"

حاجی مراد نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ مونہہ سے کچھ نہ بولا بلکہ اپنا گھوڑا سرپٹ دوڑانے لگا۔

اگناتوف نے اپنے سردار سے کہا۔

"ہوشیار ہو جاؤ۔ یہ لوگ کوئی شرارت کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی نیت میں فساد ہے۔

دوسرا سوار بولا۔

"دیکھئے نہ انھوں نے اپنے گھوڑوں کو کس قدر اڑانا شروع کر دیا ہے۔"

حاجی مراد ایک دو میل (مع اپنے رفقاء کے) سرپٹ گھوڑا دوڑاتا ہوا کوہستانی علاقے کی طرف مڑ گیا۔

نو عمر سردار نزروف نے چیخ کر کہا۔

"حاجی مراد یہ تمہاری ترکیب نہیں چلے گی۔

مگر حاجی مراد نے جواب دینا تو کجا مڑ کر بھی نہیں دیکھا' اپنے گھوڑے کو اور سرپٹ کر دیا۔

نزروف نے حاجی مراد کی نیت تاڑ کر چیختے ہوئے کہا۔

"احمق۔ میں تمہیں بھاگ کر جانے نہیں دوں گا۔"

اور پھر اپنے قوی گھوڑے کو مہمیز لگائی۔ اس کا گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا۔

کہر چھٹ چکی تھی۔ آسمان اتنا شفاف تھا اور ہوا اس قدر لطیف کہ زندگی جوانی اور امنگوں سے بھرا ہوا نو عمر سردار نزروف دل میں کوئی خطرہ و خوف لائے بغیر حاجی مراد کے نزدیک ہوتا جا رہا تھا۔

بس وہ تو دل میں اس پر خوش ہو رہا تھا کہ اب جا کر حاجی مراد کو لیا۔
نزروف کے قوی گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز قریب پا کر حاجی مراد نے اندازہ لگا لیا کہ وہ سر پر آ پہنچا ہے اور ابھی آ پکڑے گا۔
چنانچہ اس نے (حاجی مراد نے) جلدی سے پستول نکال لیا اور بائیں ہاتھ سے اپنے گھوڑے کی ذرا باگ کھینچی۔ اس کے بعد نزروف کی طرف پستول سے نشانہ باندھا۔
نزروف نے کہا۔
"یہ کیا کرتے ہو حاجی مراد۔ خبردار ایسا نہ کرنا۔"
اور حاجی مراد کے گھوڑے کو جا لیا۔ پھر ہاتھ بڑھایا تاکہ اس کے گھوڑے کی باگ تھام کر اسے روک لے۔ مگر اس سے قبل کہ نزروف کا ہاتھ حاجی مراد کے گھوڑے کی باگ تک پہنچتا' ایک دھماکا ہوا۔
نوجوان نزروف کے موںہہ سے درد سے نکلا۔
"ارے یہ تم نے کیا کیا"
اور اس نے اپنا سینہ تھام لیا۔
نزروف نے پستول کی گولی کھانے کے باوجود کہا۔
"ساتھیو۔ اس کا پیچھا نہ چھوڑنا۔ پکڑ لو اسے۔"
اس کے بعد اپنے گھوڑے کی گردن پر گر گیا۔
مگر اس سے پہلے کہ روسی سوار قریب آئیں حاجی مراد کے ساتھیوں نے ان پر فائرنگ شروع کر دی۔ پھر شمشیر زنی کرنے لگے۔
نزروف اب تک اپنے گھوڑے کی گردن سے لپٹا ہوا تھا۔ اس اثناء میں اگناتوف کا گھوڑا زخمی ہو کر گرا۔
اگناتوف اس کے نیچے دب گیا۔ اسے اسی وقت حاجی مراد کے ساتھیوں نے آ لیا۔ اور تلوار سے اس کے ٹکڑے کر دئے۔
پیٹراکوف اپنے ساتھی کی مدد کو دوڑا مگر حاجی مراد کے ساتھیوں نے اسے بھی گولی کا نشانہ بنا دیا اور وہ بوری کی طرح گھوڑے سے زمین پر آ رہا۔
مشکلین بھاگ چھوٹا اور اس نے قلعہ کا رخ کیا۔ حنیف اور بطا نے اس کا تعاقب کیا۔ لیکن وہ پہلے ہی دور نکل گیا تھا۔
جب انہوں نے دیکھا کہ اس تک نہیں پہنچ سکتے تو بقیۃ السیف روسیوں کے مقابلے کو

واپس لوٹ آئے۔

پیٹروکوف کا شکم چاک تھا۔ اس کا جوان چہرہ آسمان کی طرف اٹھا ہوا تھا۔ آخر اس نے آخری سسکی لی اور ختم ہو گیا۔

غمزالو اگناٹوف کا کام تمام کرنے کے بعد نوجوان سردار نزروف کی طرف بڑھا جو اب تک اپنے گھوڑے کی گردن کا سہارا لئے ہوئے تھا۔

غمزالو نے تلوار کا ایک ہاتھ مار کر اسے بھی ہمیشہ کی نیند سلا دیا نزروف گھوڑے سے نیچے آ رہا۔

بطا نے مردہ روسیوں کی گولی اور بارود پر قبضہ کیا۔ حنیف نے چاہا۔ کہ سردار نزروف کا گھوڑا اپنے قبضہ میں کر لے۔ لیکن حاجی مراد نے آواز دے کر اسے منع کیا۔

اس کے بعد سب نے سڑک پر اپنے گھوڑے سرپٹ روانہ کر دئے۔ غرض پانچ روسی سواروں میں سے چار مع سردار کے کام آ گئے۔ صرف مشکین بچ کر بھاگ سکا۔

بہرحال نزروف کا گھوڑا بھی ان لوگوں نے اپنے ساتھ لے لیا۔

یہ لوگ قصبہ تحا سے چھ سات میل دور نکل آئے تھے اور چاولوں کے کھیتوں میں جا پہنچے تھے۔

دفعتہً دور قلعہ کے مینار پر سے توپ کی گرج سنائی دی۔ یہ گویا روسی قلعوں والوں کے لئے خطرہ کا اعلان تھا۔

بچے ہوئے روسی سوار مشکیں سے تمام ماجرہ سننے کے بعد قلعہ کے کمانڈر نے اپنا سر پیٹتے ہوئے کہا۔

"یاخدا --- او میرے خدا۔ اب میں کیا کروں۔ یہ ان بدمعاشوں نے کیا کیا کہ ہماری حراست سے نکل بھاگے۔ آہ میں کس قدر ذلیل کیا جاؤں گا۔"

غضب یہ کہ حاجی مراد اور اس کے ساتھیوں نے اپنے نگراں روسی سواروں کا بھی صفایا کر دیا تھا۔ ان میں نوجوان افسر نزروف بھی شامل تھا۔

چنانچہ اسی وقت خطرہ کا اعلان کر دیا گیا اور قلعہ میں جس قدر سپاہی تھے انہیں مفرورین کی تلاش میں فوراً نکل پڑنے کا حکم دیا گیا۔

اس کے علاوہ آس پاس روسیوں کے زیر اثر جتنی تاتاری بستیاں تھیں۔ انہیں بھی حاجی مراد کے تعاقب میں دوڑنے کو کہا گیا۔

حاجی مراد کو زندہ یا مردہ گرفتار کرنے کے لئے ایک ہزار روبل کا اعلان کیا گیا۔

چنانچہ حاجی مراد کے فرار ہونے کے دو گھنٹے کے اندر اندر اس کی گرفتاری کے سلسلے میں دو سو سے زائد سوار اور پیدل دوڑا دیئے گئے۔

کئی میل تک مسلسل دوڑتے رہنے سے حاجی مراد اور اس کے ساتھیوں کے گھوڑے بری طرح ہانپنے لگے تھے اور پسینے میں تر بتر ہو گئے تھے۔ چنانچہ حاجی مراد نے انہیں دم لینے کے لئے ذرا روکا۔

سڑک سے داہنی جانب دور قصبہ بیزر زک کی مساجد کے مینار نظر آ رہے تھے۔ بائیں جانب کچھ کھیت تھے اور سامنے دریا بہہ رہا تھا۔

کوہستانی علاقے میں داخل ہونے کا راستہ حالانکہ داہنی طرف تھا' مگر حاجی مراد بائیں طرف مڑ گیا۔ گویا مخالف روانہ ہوا۔

اس نے یہ قیاس قائم کیا کہ اس کے تعاقب کنندگان یہی خیال کریں گے کہ حاجی مراد قصبہ بیزر زک کی طرف گیا ہو گا۔ جو سڑک کے داہنی طرف تھا۔

اس میں اس کی ایک مصلحت یہ تھی کہ آگے چل کر وہ سڑک کو چھوڑ دے گا۔ پھر قصبہ الازن کے اس طرف جا کر دوسری سڑک پکڑ لے گا جس کے متعلق کوئی قیاس بھی

نہیں کر سکتا کہ حاجی مراد ادھر گیا ہو گا۔
پھر جنگل کو پار کر کے کوہستان میں داخل ہو جائے گا۔
چنانچہ یہ سب کچھ طے کرنے کے بعد وہ بائیں جانب مڑ گیا۔ مگر دریا تک پہنچنا مشکل تھا کیوں کہ راستے میں وہاں کے کھیت پھیلے ہوئے تھے جن میں حال ہی میں گھٹنوں گھٹنوں پانی چھوڑا گیا تھا' جس سے سخت دلدل پیدا ہو گئی تھی۔
حاجی مراد اور اس کے ساتھی اب انتہائی داہنی طرف مڑ گئے۔
انہیں امید تھی کہ آگے جا کر خشک زمین آ جائے گی مگر جن کھیتوں کو وہ اس پار کرنے والے تھے ان میں بھی اتنا ہی پانی چھوٹا ہوا تھا۔
گھوڑوں کس سم کیچڑ اور دلدل میں پھنسنے لگے اور وہ گرتے پڑتے چلے جا رہے تھے۔
انہیں ہر پانچ منٹ بعد دلدل کی وجہ سے دم لینے کے لئے رک جانا پڑتا تھا۔
اس طرح ست رفتاری سے چلنے اور دلدل میں پھنستے پھنساتے ہوئے منزل طے کرنے میں انہیں شام ہو گئی۔ اور اب تک وہ دریا کے قریب بھی نہیں پہنچ پائے تھے۔
ان کے بائیں طرف زمین کا ایک اونچا سا ٹکڑا تھا جس پر اونچی اونچی خود رو جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ لہٰذا حاجی مراد نے ہار کر یہی طے کیا کہ سمٹتی ہوئی آنے والی رات اس ٹیلے والی جھاڑیوں میں ہی چھپ کر گزارے تاکہ گھوڑے بھی تازہ دم ہو جائیں۔ اور گھاس چر کر اپنا پیٹ بھر لیں۔ آخر یہی کیا گیا۔
ان لوگوں نے بھی گھوڑوں سے اتر کر روٹی اور پنیر اپنے پیٹ میں ڈالا۔
غرض رات ہو گئی۔ ابتدا میں بلند ہونے والا چاند ابھی پہاڑیوں کے عقب میں تھا۔
اس لئے ہر طرف تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔
اس نواح اور جنگل میں بے شمار جھینگر تھے جن کے شور سے دشت و صحرا گونج رہے تھے۔ حاجی مراد اور اس کے ساتھی جب تک جھاڑیوں میں حرکت کرتے رہے وہاں کے جھینگر بھی خاموش رہے لیکن جوں ہی وہ ساکت ہوئے تو جھینگروں نے وہاں پھر زور سے الاپنا شروع کر دیا تاکہ اپنے دوسرے ساتھیوں سے پیچھے نہ رہیں۔
حاجی مراد شب کی ہر ایک آہٹ پر جاگتا رہا۔ اس کا دھیان خود بخود ہر قسم کی آوازوں کی طرف جا رہا تھا۔
اسے ہمزاد کا وہی موت کا گیت یاد آ رہا تھا جو اس نے پرسوں ہی پانی لاتے وقت سنا تھا۔ اب اسے خود بھی یہی محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی بھی لمحہ اس کی پوزیشن بھی ہمزاد کی سی

ہونے والی ہے۔
ایک بار تو اس نے یہی محسوس کیا جیسے موت بالکل نزدیک آ گئی ہے اس کی روح ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔
چنانچہ اس نے چادر بچھائی اور نماز ادا کی۔ ابھی اس نے سلام پھیرا ہی تھا کہ اپنی جائے پناہ کی طرف اس نے کوئی آہٹ سنی۔ یہ آواز کیچڑ میں پڑنے والے کئی سموں کی تھی۔
تیز نظر بطا کے بھی کان کھڑے ہوئے چنانچہ وہ جلدی سے جھاڑی سے نکلا اور ایک گوشے سے باہر جھانکا۔ دور اسے کئی سائے نظر آئے یہ سائے چند پیدل آدمیوں کے اور کچھ گھوڑوں کے تھے۔
حنیف نے بھی دوسری طرف اسی طرح آدمی اور گھوڑے دیکھے یہ کرگنوف (جو کمانڈر تھا) اور اس کے سپاہی تھے انہیں دیکھ کر حاجی مراد اپنے آدمیوں سے بولا۔
"اچھا تو آج ہم بھی بہادر ہمزاد کی طرح ہی لڑیں گے۔"
آج شام کو اعلان ہوتے ہی کرگنوف مع اپنی فوج کے حاجی مراد کی تلاش میں نکل پڑا تھا۔ مگر اسے حاجی مراد کا کہیں سراغ نظر نہ آ سکا۔ چنانچہ مایوس ہو کر واپس قلعہ کی طرف لوٹنے ہی والا تھا کہ راہ میں اسے ایک بوڑھا آدمی ملا جس سے اس نے دریافت کیا۔
کہ آیا اس نے چند سواروں کو کسی طرف جاتے دیکھا ہے۔
بوڑھے نے جواب دیا۔
"جی ہاں دیکھا تو تھا۔ چھ سوار دھان کے کھیت میں گرتے پڑتے چلے جا رہے تھے۔ اس کے بعد وہ لوگ ٹیلے پر جھاڑیوں میں آ گئے۔ میں بھی وہیں لکڑیاں چن رہا تھا۔
اس خبر کو سنتے ہی کرگنوف نے اپنے ساتھیوں کا رخ موڑا۔ اس بوڑھے آدمی کو راہ بر کے طور پر ہمراہ لیا اور حاجی مراد وغیرہ کے گھوڑوں کے سموں کے نشانات پر روانہ ہوا۔
آخر اسی جگہ آ پہنچا جہاں یہ مفرورین چھپے ہوئے تھے۔ اس کے بعد کرگنوف نے آس پاس دور تک ان جھاڑیوں کے گھیرے میں لے لیا اور صبح کا انتظار کرنے لگا تاکہ حاجی مراد کو مردہ یا زندہ لے جائے۔
حاجی مراد نے فوراً اندازہ لگا لیا کہ اسے گھیر لیا گیا ہے۔ چنانچہ جھاڑیوں ہی میں ایک گڑھے کو اس نے مورچہ بنا لیا اور طے کیا کہ جب تک جان میں جان اور گولی بارود موجود ہے مقابلہ کرتا رہے گا۔

آخر اپنے ساتھیوں سے بولا۔

"گڑھے کے آس پاس کی مٹی جلد جلد اونچی کر دو اور لڑنے کو تیار ہو جاؤ۔ اس کے ساتھی فوراً اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ حاجی مراد بھی برابر ان کا ہاتھ بٹاتا رہا۔

جب اجالا ہو گیا تو روسی کمانڈر جھاڑیوں کے قریب آیا اور زور سے بولا۔

"سنو حاجی مراد تم گھرے ہوئے ہو۔ ہتھیار ڈال دو۔"

اس کے جواب میں حاجی مراد کی طرف سے گولی چلی۔ گڑھے میں سے دھواں بلند ہوا اور گولی کمانڈر کے گھوڑے کے لگی۔ گھوڑا تیورا کر گر گیا۔

اس کے بعد ادھر سے بھی چاروں طرف سے سپاہیوں نے گولیاں برسانا شروع کر دیں۔ گولیاں درختوں کے پتوں اور ٹہنیوں کو چیرتی ہوئی گڑھے کے مونہ پر آ کر لگنے لگیں۔ مگر غمزالو کا گھوڑا جو غیر محفوظ تھا ایک گولی سے زخمی ہو گیا مگر گرا نہیں۔ بلکہ بدک کر ادھر ادھر بھاگنے لگا اور اس کے خون سے آس پاس کی ہری گھاس لال ہونے لگی۔

حاجی مراد اور اس کے ساتھی صرف اسی وقت فائر کرتے تھے جب کوئی سپاہی نزدیک آنے کی کوشش کرتا تھا۔

اس طرح کئی سپاہی اس کے نشانے کا شکار ہو گئے۔ تین سپاہی سخت زخمی ہوئے اور باقی فائر کرتے ہوئے پیچھے ہٹ گئے۔

اس طرح یہ سلسلہ ایک گھنٹے تک جاری رہا۔ اب سورج درختوں کی نصف اونچائی کے قریب بلند ہو چکا تھا اور حاجی مراد سوچ رہا تھا کہ قریب میں کھڑے ہوئے اپنے گھوڑے کی پشت پر کود کر فرار ہو جائے۔

اور دریا کا راستہ لے۔ لیکن اس نے دفعتہ" اور بہت سی بندوقوں کی آواز سنی۔ کرگنوف کی امداد کے لئے، ایک کمک آ گئی تھی۔

اس کمک میں حاجی آغا بھی جو مختول کا زمیندار تھا شامل تھا' اور اپنے ساتھ دو سو آدمی لے کر آیا تھا۔

ایک زمانے میں حاجی آغا تاتاری علاقے میں حاجی مراد کے رفیقوں میں سے تھا مگر پھر کچھ عرصہ بعد حاجی آغا روسیوں سے جا ملا تھا اور اب انہی کا آدمی تھا۔

حاجی آغا کے ساتھ عقمت خان بھی تھا جو حاجی مراد کے ایک پرانے دشمن کا لڑکا تھا۔

حاجی آغا نے بھی آواز دے کر حاجی مراد سے کہا۔

"حاجی مراد اب لڑنے سے کوئی فائدہ نہیں۔"

اس کا جواب بھی حاجی مراد نے بندوق سے دیا۔

حاجی آغا نے حاجی مراد کی گولی سے بچنے کے بعد اپنے ساتھیوں سے کہا۔

"دوستو تلواریں سونت لو اور جھاڑیوں کی طرف ٹوٹ پڑو۔"

چنانچہ سو آدمی نعرے مارتے اور شوروغل مچاتے ہوئے حاجی مراد کی خندق کی طرف لپکے' پیچھے سے روسی سپاہیوں نے دباؤ ڈالا مگر خندق سے تابڑ توڑ گولیاں چلنے لگیں۔

دشمن کے تین چار آدمی ڈھیر ہو گئے اور انہیں پھر پسپا ہونا پڑا' مگر گولیاں برساتے رہے۔

چند منٹ بعد خندق تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے مگر بہت سے حاجی مراد اور اس کے ساتھیوں کی گولیوں کا نشانہ ہو گئے۔

حاجی مراد کا نشانہ بے خطا تھا۔ اسی طرح غمزالو کا نشانہ بھی بہت کم خطا کرتا تھا۔

اور اپنی گولی سے جب کسی دشمن کو ہلاک ہوتے دیکھتا تو خوشی کا نعرہ مارتا۔

خان محمد خندق کے دہانے پر بیٹھا ہوا تھا۔ کلمہ پڑھتا جاتا تھا اور وقفہ وقفہ سے فائر کرتا جاتا تھا۔

مگر اس کا نشانہ بیشتر خطا کر جاتا تھا۔

الدر کی یہ حالت تھی کہ جوش سے اس کا جسم کانپ رہا تھا وہ چاہتا تھا کہ شمشیر بکف دشمن پر جا ٹوٹے۔

اس کا نشانہ بھی صحیح نہ تھا۔ وہ بار بار حاجی مراد کی طرف دیکھتا تھا اور بعض وقت اپنے جسم کا زیادہ حصہ خندق کے باہر نکال لیتا تھا۔

حنیف آستین چڑھائے یہاں بھی اپنے آقا حاجی مراد کی خدمت میں مصروف تھا۔ وہ حاجی مراد کو بندوق بھر بھر کر دیتا جاتا تھا۔

اپنے ساتھیوں کی طرح بطا خندق کے اندر نہیں رہا بلکہ گھوڑوں کو محفوظ جگہ پہنچانے کو ادھر ادھر دوڑتا تھا۔

چنانچہ حاجی مراد کے ساتھیوں میں وہ پہلا شخص تھا جو زخمی ہوا اس کی گردن پر گولی لگی اور ہڈی توڑتی ہوئی گزر گئی۔

اس نے جلدی سے ایک دھجی پھاڑی اور زخم پر لپیٹ لی اس کے بعد پھر فائرنگ میں مصروف ہو گیا۔

ہم ان پر شمشیر بکف ہو کر حملہ کیوں نہ کریں۔" الدر نے تیسری بار تجویز پیش کی اور اس نے خندق کی دیوار سے ذرا سا اونچا ہو کر باہر جھانکا تاکہ دشمن پر ٹوٹ پڑے مگر اس کے ایک گولی لگی اور وہ دھڑام سے اندر حاجی مراد کی ٹانگ پر گر گیا۔

حاجی مراد نے الدر کی طرف دیکھا- الدر کی ہرن جیسی خوب صورت آنکھیں حاجی مراد کی طرف لگ گئیں اور بچوں کی طرح اس کے ہونٹ ہلے' پھر اس نے دم توڑ دیا-

حاجی مراد نے اس کے نیچے سے اپنی ٹانگ نکالی' اور پھر گولی چلانے لگا-

حنیف مردہ الدر پر جھکا اور اس کا بارود گولی وغیرہ پر قبضہ کیا- خان محمد بدستور کلمہ پڑھتا جا رہا تھا- اور لاپرواہی سے بندوق چلا رہا تھا-

اس اثنا میں ایک جھاڑی سے دوسری جھاڑی میں دوڑ کر شور مچاتے ہوئے قریب سے قریب تر ہوتے جا رہے تھے-

چند منٹ کے بعد حاجی مراد کے جسم میں بائیں طرف ایک گولی اور لگی- وہ خندق میں جھک گیا اور پھر زخم پر پھاہیہ رکھ لیا- مگر اب کی دفعہ اس نے مہلک زخم کھایا تھا وہ محسوس کرنے لگا کہ جیسے اب جان نکلی-

اس عالم میں اس کی آنکھوں کے سامنے کئی صورتیں گھومنے لگیں- تخیل میں اس نے دیکھا کہ قوی ابو نطل خاں خنجر بکف اس کی طرف جھپٹ رہا ہے-

پھر اس کے ذہن میں بوڑھے ورنوثوف کا نقشہ آیا جس کی مکار آنکھیں اسے دیکھ رہی تھیں- اس کے بعد اس کے تخیل میں اپنے بیٹے یوسف کا دھیان آیا-

اور پھر یکے بعد دیگرے اپنی بیوی شفاعت کی تصویر آئی- آخر میں اس کا ذہن سرخ داڑی والے اپنے پرانے دشمن شیمل کی طرف منتقل ہوا جو اپنی نیم وا آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا-

ان تمام تخیلات نے اس کے اندر کسی جذبے کو متحرک نہیں کیا-

ان خیالات نے نہ تو اس کی حسن رحمدلی غضب یا کسی آرزو کو برافروختہ یا نہ جذبہ انتقام کو، بلکہ ہر چیز کو وہ اپنی موجودہ حالت سے مختلف پا رہا تھا-

جس حال میں اس وقت تھا یا اس سے قبل جو اس پر گزر رہی تھی' وہ جیسے ایک بالکل ہی علیحدہ چیز تھی-

اس کے باوجود بھی اس کا مضبوط بدن جنگ و مقابلے سے نہ تھکا- چنانچہ اپنی آخری قوت کو جمع کر کے وہ خندق میں اٹھ کھڑا ہوا اور اپنی طرف بڑھنے والے ایک شخص کو گولی کا نشانہ بنا دیا-

اس کے بعد حاجی مراد خندق سے باہر نکل آیا اور خنجر ہاتھ میں تھامے ہوئے لڑکھڑاتا ہوا دشمن کی طرف بڑھا-

لیکن اس کے جسم پر کئی گولیاں پڑیں۔ جن سے وہ مزید زخمی ہو کر گر گیا گولیوں نے اس کا جسم قیمہ کر دیا۔ کئی سپاہی اپنے نڈھال اور افتادہ دشمن کی طرف خوشی کے نعرے مارتے ہوئے بڑھے۔

لیکن حاجی مراد قوی جسم جس کے متعلق سمجھ لیا گیا تھا کہ ٹھنڈا ہوا دفعتہ" درخت کے تنے کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔

اس عالم میں وہ اس قدر ہیبت ناک و بارعب نظر آ رہا تھا کہ جو سپاہی اس کی طرف لپک رہے تھے۔ دفعتہ" ٹھٹک کر رہ گئے۔

مگر فوراً ہی حاجی مراد موت کی گرانی سے آخری بار اس طرح تیورا کر گرا جیسے کھونٹی پر سے کپڑا گرتا ہے۔

اس کا قوی جسم زمین پر اس طرح پھیل گیا جیسے خاردار جھاڑی کٹی پڑی ہو۔ اس کے بعد وہ ہل نہ سکا۔

وہ ہل تو نہ سکا تھا مگر اب بھی کچھ محسوس کر رہا تھا۔

سب سے پہلے اس پھیلے ہوئے غیر متحرک جسم کی طرف حاجی آغا بڑھا اور اس نے لاش کی گردن پر تلوار ماری۔

حاجی مراد نے محسوس کیا جیسے کوئی اس کے ہتھوڑے مار رہا ہے وہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ کون مار رہا تھا اور کیوں مار رہا تھا۔

یہ اس کے احساسات کی بالکل آخری بیداری تھی۔ اس کے بعد وہ کچھ محسوس نہ کر سکا۔ اس کے دشمن ٹھوکریں مار رہے تھے۔ اور اس کے ضربیں لگا رہے تھے مگر اب حاجی مراد کہاں رہا تھا۔

حاجی آغا نے لاش کی پشت پر پیر رکھ کر اور دو ہاتھ مار کر لاش کا سر تن سے جدا کر دیا۔

گردن کی شہ رگوں سے لال لال خون کے فوارے چھٹ نکلے اور کٹے ہوئے سر سے کالا لہو بہنے لگا۔ جس سے زمین اور آس پاس کی جھاڑیاں رنگ گئیں۔

حاجی آغا اچھل کر الگ ہو گیا تاکہ اس کے جوتے نہ رنگ جائیں۔

کرگنوف، حاجی آغا، عصمت خان اور تمام سپاہی لاشہ کو اس طرح گھیرے کھڑے تھے جیسے اس اکیلے مرد غازی کو قتل کر کے انہوں نے زبردست معرکہ مارا تھا۔

حاجی مراد کے ساتھیوں میں سے حنیف۔ خان محمد اور غمزالو بچ گئے تھے انہیں گرفتار کر

لیا گیا۔
پھر بارود کے دھوئیں سے اٹی ہوئی فضا میں فتح مند دشمن خوشیاں منانے لگے۔
اس جدال و قتال کے ہنگامے میں جھینگر اپنے نغمے بھول کر سہمے ہوئے بیٹھے رہے۔
جب اس چھوٹے سے میدان جنگ میں بار دیگر سناٹا چھایا تو انہوں نے پھر سے اپنا ترنم چھیڑا۔ اُن کی آواز سن کر قرب و جوار کی دوسری جھاڑیاں بھی گونج اٹھیں۔
اسی گراں موت کو دیکھ کر مجھے ہل چلے ہوئے ایک کھیت کی وہ خار دار سخت جھاڑی یاد آئی تھی!

Лев Толстой.

لیوٹالسٹائی 1828ء میں پیدا ہوا۔ رُوس کا وہ فلسفی اور ادیب جو ساری دنیا میں مشہور ہوا۔ وہ نو برس کی عمر میں باپ سے محروم ہوگیا، سولہ برس کی عمر میں یونیورسٹی میں داخل ہوا لیکن اپنی مخصوص افتادِ طبع کے سبب تعلیم جاری نہ رکھ سکا۔ اس نے ڈگری لیے بغیر یونیورسٹی چھوڑ دی اور 1849ء میں اپنی جاگیر میں کاشت کاروں کے لیے ایک سکول قائم کیا، سکول ناکام ہوگیا۔ وہ ماسکو اور سینٹ پیٹرز برگ میں رِندی و سرمستی کی زندگی بسر کرنے لگا۔ 1851ء میں اسے ایک ملازمت مل گئی۔ 1854ء میں وہ فوج میں شامل ہوگیا۔ اُسی عہد کے تجربات تھے کہ دنیا کی ایک عظیم تخلیق وجود میں آئی ''جنگ اور امن''۔ پھر فوج سے بھی اس کا جی اکتا گیا اور وہ اِدھر اُدھر گھومتا رہا، کبھی ماسکو میں اور کبھی جاگیر میں۔ ماسکو میں ترگینیف اور دوسرے ہم عصر ادیبوں سے اس کے دوستانہ مراسم ہوئے۔ اس نے اپنے تمام مزارعوں کو آزاد کر دیا اور ان کی بہبود کے لیے ایک بار پھر سکول قائم کیا جو ظاہر ہے پھر ناکام رہا۔ 1857ء اور 1860ء میں وہ یورپ چلا گیا۔ واپس آنے کے بعد 1862ء میں صوفیہ نامی ایک عورت سے شادی کر لی۔ آیندہ پندرہ برس میں اس نے خود کو اپنی جاگیر تک محدود رکھا۔ 1876ء میں وہ اپنے نظریات و افکار میں زیادہ شدید ہوگیا۔ اس نے سخت روحانی بحران کے بعد عدمِ تشدد اور انسانی محبّت کو اپنا مذہب قرار دیا، پھر زندگی بھر یہی مقصد حاصل کرنے کے لیے سرگرم رہا۔ اُس نے اپنی ساری دولت غریبوں میں تقسیم کر دی اور زبان اور قلم سے اخوت، مساوات اور جمہوریت کی تلقین کرنے لگا۔ یہ وہ دور تھا جب رُوس کے انقلاب کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ ٹالسٹائی کے انقلابی افکار کا اثر ساری دنیا پر ہوا۔ لوگوں میں اس کا ذاتی اثر و رسوخ اس قدر زیادہ تھا کہ روسی حکومت اس کی سرگرمیوں پر ڈاکا مارنے کی جرأت نہیں کر سکی۔ روسی کلیسا نے اسے 1901ء میں کلیسا سے خارج کر دیا تھا۔ اس نے کہانیاں بھی لکھیں، ناول بھی۔ ترکے میں اس نے ناقابلِ فراموش تحریریں چھوڑی ہیں۔ ''اینا کرینینا'' اور ''جنگ اور امن'' جیسے ناول اور کہانیاں۔ 1910ء میں اس کا انتقال ہوا۔ وہ ایک عہد آفریں انقلاب کی حسرت دل میں لیے مر گیا۔

شکیل عادل زادہ

ХАДЖИ-МУРАТ

Лев Толстой

حاجی مُراد ٹالسٹائی کا آخری ناول ہے۔ انقلابِ رُوس سے پہلے کے وسطی ایشیا کے علاقے کاکیشیا میں ٹالسٹائی نے اپنی زندگی کے کچھ ایام بسر کیے تھے۔ اس علاقے میں صدیوں سے بسنے والے مسلمانوں، ان کی تاریخ، رسم و رواج اور تمدّن سے ٹالسٹائی بےحد متاثر ہوا۔ وسطی ایشیا کا یہ علاقہ رُوس کے بڑے ادیبوں کے لیے ہمیشہ دلچسپی کا باعث رہا ہے۔ پشکن نے بھی اس علاقے کے مسلمان لیجنڈری ہیرو پر ایک ناول ''کپتان کی بیٹی'' لکھا تھا۔ ٹالسٹائی نے ''حاجی مُراد'' کو چُنا۔ حاجی مراد کا کردار انسان کی عظمتوں، خامیوں اور نازک جذبات کا جیتا جاگتا مجسمہ بن کر ٹالسٹائی کے تخلیق کیے ہوئے کرداروں میں نمایاں مقام رکھتا ہے۔ حاجی مُراد حریت پسند ہے، وہ انا کا شکار ہے.... وہ انا جو اسے امام شامل سے علیحدہ ہونے پر مجبور کر دیتی ہے، وہ اپنے بیوی بچوں کے لیے تڑپتا ہے، ان کی زندگی کے لیے وہ سفید رُوسیوں کے بادشاہ ''زارِ رُوس'' سے بھی مفاہمت کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے.... لیکن اپنی مذہبی جذباتیت، عقیدے کی سچائی اور رُوس دشمنی، جو آزادی کی علامت ہے، سے دستبردار نہ ہو سکا۔ یہ اس کردار کی وہ پیچیدگی ہے جس نے ٹالسٹائی جیسے عظیم ناول نگار کو متاثر کیا تھا۔

سیّد قاسم محمود
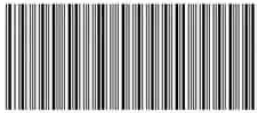
BookCornerJlm
bookcornershowroom
bookcornerjhelum
bookcorner
0321-5440882
Jhelum (Pakistan)